

پھر وہیکہ تم سنائے روشنی

مصباح علی سیّد



پھر دیکھ تمناؤں روشنی

اوہی آوازیں کچھ دیر بعد آہنگی میں داخلہ چھینکوں سے موضوع ہی بدل گئیں۔ سب میں ایک اچھلی سی جچی تھی۔ غرضی، دلوں اپنی جگہ جگ ہونے والی تقریب اپنی جگہ کچھ جلدی سوئے کچھ دیر سے، لیکن وہ نہیں جانتی تھی رات کیسے کئی، کس وقت دو کمرے سے نکل کر گوریلہ دور سے محفوظ لابی میں چلتی رہی پھر سامنے دیوار گیر شیشے کی دھڑ کے سامنے بیٹھ گئی۔ دماغ لاوے کی مانند یک کراب الجا ہی چاہتا تھا، رات درختوں سے زمین تک پھسلتی آ رہی تھی، اندھیرے میں ڈوبا سبز لان سیاہی میں تحلیل ہو کر برجوں والی حویلی میں داخل کیا۔

سفید برجوں والی اوہی حویلی کی سارے علاقے میں کبھی ایسی دھماک تھی جیسے دو برجوں کے درمیانی فاصلے میں محرابوں کی ٹکائی دور سے دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچے محسوس ہوتی تھی مگر وقت نے بہت کچھ بدل دیا تھا۔ لڑائی جھگڑے کے نتیجے میں ہونے والے علاج معالجے پر بہت سی زمینوں کے ساتھ گھر کے فرد کا بھی مقابلہ ہوا۔ حویلی کا صرف نام رہ گیا تھا یا ایک خست عمارت۔ اب برجوں والی کے اندر صرف اوسط درجے کے لوگ رہ رہے تھے۔ محرابوں کے بیچ میں نصب سفید سینٹ کی چتروں والی سیم زدہ جانی کے سامنے اس نے خود کو بیٹھے پایا۔ اس کی نگاہ مشرقی پہاڑ سے دھولان کی جانب زمین پر تھی جہاں آبی عمارت کے ڈھانچے میں کہیں کہیں سے چھوٹے درود

بلب بلب دیکھائی دے رہے تھے۔ رات اتنی ہی آتی تھی لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا تھا۔ لگاؤ کے سامنے سے شیشے کی دھڑ دھڑ گئی۔

وہاں وہ پودا، شیشم کے درختوں سے ڈھکی ٹل کھاتی سیاہ سڑک، بھیجی معمول سے زیادہ پرسکون دیکھائی دے رہی تھی۔ ابھی پھٹکی چل کر ہی اس کے دل میں کہیں اندر جکھٹانے لگی۔ کچھ عرصہ پہلے یہ سڑک گہری اور سنسان سی تھی۔ دن کی روشنی میں اکاؤ کا کوئی گڑبڑاؤ بھی چپ چاپ اپنے رستے پر۔ دور دور تک زندگی کی ٹل چل کا چاہ نہیں تھا۔

ایک پر نظر سڑک، ایک طرف کھائی دوسری جانب پھاڑ، پھاڑوں کی طرف سڑک شکل ضرور ہے مگر طے ہوئی جاتا ہے، کہتے اس کھائی کا قعر بنے، کچھ پھاڑوں سے گھرا کر مرے۔ چھوٹی سی زبان نکال کر بارش ہونٹوں پر ٹکرتے سدھم ہو گئی۔ یہ تھی خواہ مخواہ آج سڑک یاد آگئی۔ دہائی نے کچھ دن پہلے بتایا تھا، لوٹی سڑک پر کئی سال بعد پچھلے پتے یا تار کول پچھا یا کہا ہے جس کی چمک گرد نے ابھی ماتہ نہیں کی، ابھی اس سڑک کے پچھنے پر ٹھیکیا طلائے والے خا سے پرہم ہوئے تھے، حالانکہ سڑک بننے سے علاقے میں ترقی ہوتی ہے، مایہ ناپے استوار ہوتے ہیں، روزگار ملتا ہے، سہولتیں ملتی ہیں، اجالوں کی سمجھ میں تو یہ بات آتی تھی مگر بڑھوسوں نے تو ٹھیکے دار، مزدوروں کو اس قدر ٹھگ گیا تھا، جھانکار کول اور پھراٹھا اٹھا کر ادھر ادھر پھینکتے تھے، سب کا خیال تھا شاید بارش سے بہا آنے والے پانی سے گھبرا رہے ہیں۔ امام وین جس کے کبے میں سب بڑھوسوں میں ایک تھا بڑھوسا پے سے لرزنی آواز میں انوکھی بات کہہ گیا۔

”پانی کا کیا ہے، وہ تو قحطیب میں آئے گا، سڑک سے نہ کسی پھاڑوں سے پھسل کر مگر صاحب سڑک پر مل کر جو ٹھگ گیا، وہ پلٹ کر نہیں آنے والا، وہ پانی ہو یا اولاد، پانی تو زمین میں اتر کر سوکھ جاتا ہے، اولاد سوکھا کر زمین میں اتار دیتی ہے۔“

سب نے حیرت سے اس کے جملوں سے ہرے پھرے کو دیکھا تھا، جہاں گھر تھی غم تھا۔

”میرے بیٹے جوان ہو رہے ہیں، اگر وہ اس پر چڑھ لگے میرا بڑھوسا پا تو رل گیا، شہر لگے گا انہیں اور مجھے ہدائی۔۔۔“

امام دین کا یہ جملہ اس نے اپنے بڑوں سے سنا تھا اور بہت حیرت ہوئی تھی، بسلا شرمی کو کیسے نکل سکا ہے۔ پھر امام دین کو روکے دیکھا سڑک کو پہنچے، وہ روکنا جاتا، سڑک ختی جاتی، پھر اس کا غصہ پیدا ہوا تھا، اس کا بیٹا سڑک پر چڑھ کر شرم نکل گیا تھا، آتا تھا، کبھی کبھی شروع میں بیٹوں بعد پھر عید، شبِ برات سے ہوتی بات سالوں پہنچی، یہی بچے سب ادھر ہی تھے امام دین کے ساتھ۔ شروع میں خرچہ بھی بھجنا تھا۔ کم کرتے کرتے بات ہی ختم کردی۔ کوئی کہتا اس نے وہاں شادی کر لی ہوئی کہتا اس کا خون سفید ہو گیا۔

وقت گزرتا گیا، اس کی یہی انتظار میں بڑھی ہوئی، بچے جوان، امام دین نے انہیں سڑک پر چڑھنے کے لیے فارغ چھوڑا ہی نہیں تھا، سکول تو کیا دیکھا نا، بس، بڑا، ک جیسا کوئی حرف لکھتے نہیں دیا، ہماروہ خان کی زمیوں پر چھوڑتے زور دے کر کہا تھا، نہیں اتنی فرصت ہی نہ دینا سڑک لکھو تو کیا دیکھ بھی سکیں اور اب ان کا سوچ کر غصہ کا دل بدٹھی میں دھڑکا۔

”مگر رنج چاہا، اسٹیشن تو اپنے بچوں کو چڑھانے کے لیے رکھ جاتی ہیں، تم تو ان کے لیے دیوار ہی بنا مکے۔“

فیصلے میں آسانی ہوئی۔ پھیلی کے کناروں سے جہز آئیں، پوچھ کر وہاں اپنے کمرے کی جانب بڑھی، ہر اہم قدم پہلے سے زیادہ مضبوط لگا۔



ہم دھڑکتے ہی ان کی کیب بڑے سے پہنچی گئی تھی، اندر داخل ہوئی، چوڑی سی سیٹھی سڑک کے دونوں جانب بڑے بڑے ایسے گراؤں تھے جن میں کھاس کھیں اور چا کھیں بالکل پکا گیا تھا۔ کچی کھاس کو مزید روئے تے اسٹوڈنٹس کے گروہ کے گروہ تھے لڑکے لڑکیاں، کچھ نے سفید اور آل پہن کر کئے تھے۔ کچھ کہیں پر ڈالے اپنی دنیا میں گمن۔ کچی گروہ کی صورت بیٹھے تھے۔ کتا میں کھلیں تھیں اور کچی ہاتھ پاؤں کے مشابہہ، ڈاکٹر کچڑے بیٹھے ایک دوسرے کو جانے کیا سمجھا رہے تھے۔ ہماروہ خان نے ان سب پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ انہیں خاصا متعجب لگا تھا لڑکے لڑکیوں کا اتنا فزنی انداز میں اکٹھے بیٹھا۔ ان کی کیب جیسی اسٹیشن پر کی تو ہماروہ خان نے اس سے پوچھا تھا۔

”پہلے جانا کہاں ہے کچھ بتا بھی ہے۔“

”ایس میں آفس۔ یہ جمع کرونی ہے۔“

اس نے گاڑی سے اترتے ہاتھ میں پکڑی اپنے اور پیکل ڈاکوٹنس کی فائل دکھائی تھی۔

”تمہیں یقین ہے تمہارے اصل ڈاکوٹنس پانچ سال ان کے پاس رہیں گے۔“

امروڈ خان کو خاصی حیرت ہو رہی تھی، پانچ سال میں کوئی بھی ضرورت پڑ سکتی تھی۔ ٹھتہ پارے ڈاؤن سے کبہ رہی تھی۔

”جی۔ ایم بی بی ایس کپیٹ ہونے تک، یہ اسٹوڈنٹ کی تہہ کی گارنٹی ہے۔“

ان کی ہر بات سے انجان ذریعہ نانت میں چادر کا پلو دہائے حیرت سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی، ایسے قلمی ادارے میں ٹیکلی ہار آنا ہوا تھا اور اسے کس نے پوچھا تھا یہاں آتے ہوئے اگر اس کے علاج کا خیال نہ ڈالا جاتا، پھر کیسا ہوا چلو بہانے سے اس کا جیکب اپ بھی ہو جائے گا، بہانے سے ہی کسی اس کا علاج ہو جائے گا۔ وہ بہت غور تھی۔ ہر تھوڑی دیر بعد کوئی ایسویٹس نوں نوں سا زن بھاتی پاس سے گزرتی وہ اچھل جاتی۔

”اللہ رے۔ گناہے کوئی لڑائی جھگڑا ہوا پلازم دھکا، کیسے ایسویٹس آئے جا رہی ہیں۔“

امرا نے مسکرتے ہوئے ناک سے کسی لڑائی تھی۔

”یہ میڈیکل کالج ہے، یہاں ایسویٹس ٹیکس آئے گی تو کیا ہمارے بھانڈوں پر بھرے گی۔“

ذریعہ نانت کی ٹھٹھکی لگ رہی تھی۔

”ٹھٹھکی تمہیں یہاں ڈر تو بہت لگے گا۔“

”ڈرنے کی کیا بات ہے ہماری ٹھٹھکی بہت بھار ہے۔“ ٹھٹھکی جگہ جواب امروڈ خان نے دیا۔ اس کا حوصلہ بڑھ گیا تھا، اسے کبھی بھی یہ یقین نہیں تھا اس کے اس عرق میں کم از کم اس کی اپنی ٹیکلی ساتھ دے گی۔ جب اس نے ٹیکلی پار یہ بات منہ سے نکالی۔

”مجھے ڈاکٹر بننا ہے۔“

خانیا اس تو قلمی ہی تھیں۔ منورہ چاہی تھیک میں فیس فیس کر دہری ہوتی تھیں۔

”مڑے (ارے) خانی تیری بیٹی نے دو نمبر کیا ہے، لے، اس کا بھیجا پلٹ گیا۔ یہ ڈاکٹر ہے گا، لو کر نو بات ہم نے بھی سکول نہیں دیکھا یہ ڈاکٹر ہے گا۔“

خانی ماں کو اس کے ارادوں سے خوف محسوس ہوا۔ وہ بچپن سے ایسی ہی تھی جو بات کہہ دی سواڑ لگتی، پھری کروا کر دم لیتی تھی۔ سکول تک جانا، سہیلیوں سے مل لینا۔ یہاں تک تو بات درست تھی لیکن ڈاکٹر یعنی پڑھنے کے لیے دور سفر جانا۔ یہ تو ان کے لیے ایسے ہی تھا جیسے ایمان سے بھر جانا۔ وہ تو اس بات پر راضی نہیں تھیں۔ علاقے کے کالج سے اعز ہی کر لے، بات سیف خان تک جا پہنچی۔



رات درود پکار پر بھسلتی حویلی کے اندر تک جا چکی تھی، منور کی سنہری لکڑی سے بنے ہماری سے صوفے پر سیف خان لٹک لگائے بیٹھے توہ پنی رہے تھے۔ کمرے میں توہے کی گرماٹھ اور منور کی ہلک جھب بھیل جب بچت کے کمرے میں داخل ہوئے ہی سیف خان نے ہاتھ میں بکڑی بیانی تھیں پر رکھتے اپنے مخصوص اعداد میں پکارا۔

”آؤ بیٹھو۔“

انہوں نے اپنے پاس اس کی جگہ خالی تھی مگر وہ سامنے بیٹھ گئی۔ لگاؤ بچائی میں ہرے گرم توہے پر تھی۔
”میں نے سنا ہے، مگر میں کوئی بات چل رہی ہے۔ کیا مسئلہ ہے؟“
”مسئلہ نہیں خواہ اٹھ۔“ ”مجھ غصوں تھا منور جیسا مگر لگاؤ میں ہے توہے جیسی الجھائی تھی۔“

”خوابشیں صرف مرد کی ہوتی ہیں۔ عورت تخیل کے لیے ہوتی ہے بچے۔“ سیف خان کے اندر کارواہی پٹھان گرم ہوا تھا۔

”میں مان لیتی راجی۔ اگر دل کی دھڑکن محسوس نہ کرتی ہوتا ہمارا سوچے پر خدا کسا جا، کہ عورت دل رکھتی ہے، اس کے اندر احساسات پھونکتے ہیں۔“

گہرا تاثر دیتے ہوئے سیف خان کی ہنسیوں کے کنارے آپس میں جڑ گئے تھے۔ آج سے پہلے کسی لڑکی کو ایسے بولتے سنا تھا نہ دیکھا تھا، اس سے پہلے وہ کچھ کہتے امر دلا اور درختی ایک ساتھ اندر داخل ہوئے تھے۔

ماضی وقت مسئلہ جاننے میں انہیں زیادہ وقت نہیں لگا تھا کیونکہ کئی دن سے ایک بحث چل رہی تھی ”فجرتہ کا لُج جانا چاہتی ہے اور یہ جا کر دم لے گی۔“ اس کا کا لُج جانے کا کہنا ایسا ہو گیا تھا جیسے اس نے لندن جانے کا کہہ دیا ہو۔ یہ ایک پہاڑ کی مسافت پر ڈگری کا لُج تھا، کئی برس پہلے جمال خان علاقے کے ضلعی ناظم بنے تھے جب ہی دوٹ لینے کے لیے علاقے میں بہت سے کام کروئے تھے۔ لڑکیوں کا ایک ڈگری کا لُج منظور کروا لیا۔ وقت کے ساتھ اضافہ بھی آ گیا۔ اب تو اس جانب کافی روشنی تھی سڑک بھی پکی ہو گئی تھی، کئی گھرانوں کی لڑکیاں کا لُج جانے لگیں تھیں لیکن عروج حویلی سے ابھی کوئی نہیں لگی تھی۔ یہاں تھی بھی کون جی کا لُج جاتی۔

ایک زر بخت، دوسری بخت، جمال خان کی ناگہانی وفات نے سیف خان کو بالکل توڑ کر رکھ دیا تھا۔ دنیا میں دوی بھائی تھے۔ بھائی بھی ایسے محبت و مظلوم میں پرے علاقے پر ہماری، اس طرح جڑے درمیان سے کوئی سولی نہ گزار سکے، نایک ایک چیز میں یاد دہی تھی، بھر دانت بھی نہ چھوڑا، کوشش بہت کی تھی پر اللہ کو منظور نہیں تھا، غشیں، مرادیں، دوائیوں مانجیوں کے نوکے مکر تو نہ چڑھے، کچھ آدھ میں ختم، کچھ مبینہ وقت پر، ڈاکٹر سے مشورہ شرم کی حد توڑنے کے حوالہ تھا، مگر علی علاج سے خالی کو تک ضرور مل گیا تھا مگر بیٹا نہیں، جمال خان کے دل کا حال اپنی جگہ مگر اعتبار بھی نہیں کیا تھا، کچھ شاعری طبیعت تھی، ماشاء اللہ بھائی کے دو چراغ تھے۔ سو گھر کے دروازے پر روشنی رہی۔ وقت گزرا کہ جمال خان بھی گزر چکے، ترکہ میں چاندی کے ساتھ چھوڑیں دو بیٹیوں کو۔ دیکھ کر سیف اللہ کا دل بھر بھرا آتا تھا، جمال خان کی چمکی بری پر تو زر بخت کا علاج امرود خان سے کر کے ڈھکی دل پر مرہم رکھ لیا۔ زر بخت اس وقت دسویں میں تھی، امرود کو بی اے کیسے بھی دو سال سے لوہے ہو چکے تھے، باپ کے ساتھ اپنا آبائی کام بہت خوشی سے کر رہا تھا، شادی کے وقت دونوں کی عمروں کا آٹھ نو سالہ فرق جو اس وقت محسوس بھی ہوا زر بخت نے خانی بیگم کی کاپی بن کر دو سالوں میں ہی مٹا دیا تھا۔

درختی شروخ سے لاپرواہ جم کر بیٹھنے سے لوہ جانے والا تھا، بمشکل کھل کی تھی جب امرود لالہ بی اے کے بعد بھی پہاڑ کی کھجلی زمین پر باجرہ بکئی اکار ہے ہیں تو اسے اکاتے شرم آئے گی؟ جب کرنا ہی بکئی کام ہے تو بی اے جائے پہاڑ میں، آنکھوں کی کتابیں دوست کو تھک کر خود زمینوں پر جانے لگا، زمینوں سے سارے علاقے میں گھومتا گھومتا کچھ سرجے حامن موتی ناپ بن گیا، پورے گھر میں ایک فجرتہ تھی باقاعدگی سے سکول جانے

والی۔ اس روز لالہ اسے لاتے لے جاتے تھے، ابھی اگر درخت کی کولانا چڑھتا تاک بھنوں چڑھتا، سارے رستے
 گھور اس نکال نکال سانس خشک رکھتا، کچھ عرصہ اس نے برداشت کیا آخر ایک دن سیف خان سے کہہ ہی دیا۔
 ”والی! ہم درخت کی کے ساتھ نہیں جائے گا۔“

منورا چاہتی نے گھر کا، خانی بیگم برس ہی پڑیں۔

”کیوں نہیں جائے گا؟“

”کیونکہ یہ بہت قصہ کرتا ہے، ہمیں پہاڑ سے دھکا دے دے گا۔“

”آرام سے بات کرو۔“ خانی بیگم اونچی آواز میں بڑبڑائیں کہیں۔ ”اوپر، پہاڑ سے دھکا دے دے گا۔“

مالک ہے وہ تیرا۔“

بارہ حیرہ سالہ بچی کے منہ سے نکلا تو نہیں ٹکے تھے ابھرتے بھولی سی سبز آنکھوں سے ابھمن المتی تھی۔

”مالک تو چاہیو کہے ہوتے ہیں، جانوروں کے ہوتے ہیں۔ مس کہتی ہے مالک اللہ ہوتا ہے، پر میرا مالک

یہ ہے، یہ بد چیز!“

خانی بیگم سے پھسل کر نکلا، دے سے پر کھڑے درخت کی پرکھی تھی جس کی گردن حریت تنگی تھی۔ ماتھے پر کرنٹلی۔

جستہ گھر کی سب سے بھونی بچی تھی اور سیف خان بہت سہراں، دو ماہی لٹکتے سے اٹھے۔ بہت چارے بولے

تھے۔

”چلو آج سے ہم چھوڑنے جائے گا نہیں۔“

دو چار سال کی بات تھی، ابھر شادی کروائی تھی سیف خان کو اس کی بات ماننا اچھا لگا تھا۔

پہاڑوں پر اترتی چڑھتی دھوپ نے سال جاتے وقت نہیں لگا پڑا۔ کوئی سوچ بھی نہیں سکتا تھا سیاہ کڑھائی والی

چارہ میں لپٹی سر جھکائے چلتی لڑکی پورے علاقے میں غائب کر جائے گی، کچھ دلی تھی اور بہت تھی اس سے زیادہ

حب ہوئی جب اس نے کہا۔ وہ کالج جائے گی۔ چاہی ماں کو اس کی بات سمجھائی اعتقاد لگی، خانی بیگم نے جھاڑ کر

رکھ دیا۔ وہ شادی کا سامان دھڑ دھڑا کٹھا کپے ٹنگی تھیں اور وہ منہ سر کتابوں میں جھونکے کی باتیں کر رہی ہے اور

زربخت تو اس کے دوسری سے آگے چڑھنے پر ہی دم بخود تھی۔

”بھری بھی تو شادی کر دی تھی، ماس کی بھی ہوئی چاہے در نہ چہرے کا نور کتنا ہیں چاہے لیس کی، نہ بھولیں رہے گا نہ حسن۔“

جنت نے ان عورتوں میں سرکھانے کے بجائے امروڈ لال کا ہاتھ بکڑ لیا تھا۔

”آپ تو کہتے تھے ہم آپ کے بچوں کی طرح ہے۔ اگر آپ کی بیٹی بڑھنے کا کتنی تو نہ پڑھاتے۔“

امروڈ خان کی گہری ٹکا ہیں اس کے چہرے پر گڑھی روئی تھی۔ ان کی دو بیٹیاں تھیں، ایک عین سال کی، ایک چار کی، ماس وقت اس کی چہرے میں ان کا بھرپور جھلکا تھا۔ غصہ کے کندھے پیار سے جھکے۔

”جو دانی فیصلہ کریں گے، دیر یا ہوگا۔“

دانی بن کر کچھ دیر تو چہرہ پر ہرقل سے بڑھا۔

”آگے پڑھ کر کیا کرو گی؟“

”ڈاکٹر..... ڈاکٹر بنوں گی۔“

خانی بیگم، منورہ چاہتی اور زربخت کو تو سناپ سوگھ کیا تھا۔

”بیٹا سے جو کرتے ہیں ہسپتال دیکھتے دیکھتے جان سے چلے جاتے ہیں، بیٹا پر ہسپتال بٹاؤں گی، عورتوں کو اجازت نہیں امروڈ ڈاکٹر کے پاس جانے کی، ایڈمی ڈاکٹر ہوتی چاہیے، ہماری عورتوں کے لیے۔“

وہ ایسے دہد میں بولی تھی جیسے بیٹا پھیل سیدان میں ڈھل بھی گیا ہو اور ہسپتال کی عمارت اونچی ہوئی جاتی ہو، دانی کو امروڈ نے اشارے سے چہرہ ہنسنے کا کہا تھا۔

”اعتر کا کیا ہے کر لیتے دو، اب تو ملا تے کی کئی لڑکیاں کالج جا رہی ہیں۔ رہی ہاں ڈاکٹر بننے کی، وہ جتنا اٹکا آسان نہیں جیسا میٹرک میں ٹاپ کرنا، ابھی تازہ تازہ خبریں سنی تھیں میڈیکل کالج کا نرس آسان سے ہاتھیں کرنے لگا ہے۔ ہر سال ادھما بپ، بچوں کا روٹا بیٹھا، احتجاج، توڑ پھوڑ، خودکشی و خودکشی کی کوشش، بعد ڈکے ٹاپ رہ جاتے ہیں یہ تو بھر ملا تے کی ہے۔ بھرا ٹکار کر کے اس میں بغاوت ضرور بھرتی ہے۔“ دانی نے ناچاچے ہوئے نیم رضامندی دے دی تھی مگر غزنی تھے سے اکڑ رہا تھا۔

”آج کالج جانے کا کہہ رہی ہے، کل شہر جا کر پڑھنے کا کہے گی۔ لوگ ہم کو ہاتھیں داریں گے۔“

چار ماٹھے تک پہنچتی فحشہ اس کے پاس سے گزرتے گزرتے آہٹگی سے کہہ گئی۔
 ”ڈاڑھے تو نہیں ماریں گے۔“

”دیکھا دیکھا دانی، ابھی سے کتنی زبان ہے اس کی۔ کل کو اور آ کے سے چلانے لگے گی۔“
 کمرے کی جانب بڑھتے فحشہ کے قدم اس کے جلوں پر رکے، پلٹ کر آئی اور منظم انداز میں کہا تھا۔
 ”پڑھوں گی تو قسم چلے گا، زبان رک جائے گی۔“

درخونی نے غصے سے گھبراہٹا۔ اس کی ایک لیمبو مرضی بھی نہیں تھی کہ وہ حریص کے پڑھے، ہر ممکن احتجاج کیا تھا لیکن امر دلالہ نے اس کے غصے کو نرمی سے قابو کر لیا تھا۔



اس کا ڈگری کالج میں پہلا دن تھا اور فحشہ نے ذہن پر ایسے سوار کر رکھا تھا جیسے اس کا پہلا امتحان ہو۔ ایک ایک چیز بیک میں موجود ہونے کے باوجود کوئی دس بار اٹھ اٹھ کر بیک چیک کیا تھا، پھر یہ معمول بن گیا۔ رات کو ہر جہاز کر ٹیبل سے سر ہانے رکھتی تھی۔ اسے پتا تھا اس کام میں اس کا ساتھ دینے والا کوئی نہیں ہے۔
 عام طور پر بچوں کی چیزیں مائیں چار کر کے رات کو سوتی ہیں لیکن خانی بیگم اس حق میں ہی نہیں تھیں کہ وہ پڑھے۔ انہیں بھی فکر تھی کہیں پڑھائی اس کا دماغ اور پھاسی نہ کر دے، اہم میں، ہماری روایات میں نقص ڈالنے لگے، صرف دانی یا امر دوزی تھے جنہوں نے ڈرتے ڈرتے گمراہی کا خطرہ دلوایا تھا۔ فحشہ کے لیے یہی بہت تھا، اپنی چیز کا خیال وہ خود ٹیک سے رکھ سکتی تھی۔ اپنی کتاب، غم قدر کے ساتھ بیک میں رکھ کسی مقدس چیز کی طرح بیک سینے سے لگائے ہزاروں دھپ تھے جنہیں آنکھوں میں جلا کر چمکھٹ پار کرتی تھی۔

وہ امر دوز لالہ یا دانی کے ساتھ ہی کالج آتی جاتی، بہار سردی گری، ہمارے طوفان اسے کس چیز سے غرض نہیں تھی بس اسے نمبر چاہئیں تھے۔ اسنے کے اس کا داخلہ میڈیکل کالج میں ہو جائے، اسے اتنا پتا تھا ہمارے نمبر میڈیکل کے لیے اس پر کوئی بچا اس ساتھ لاکھ خرچ نہیں کرنے والا اور کرتے بھی کہاں سے، مگر کاساڑو سامان بیچے یا خود کو.....؟ جو کرنا چاہا اپنی صحت کے بل پر کرنا ہے۔

اس کی صحت پر ہی درخونی کو مل پڑے تھے، کوئی حربہ نہیں چھوڑا تھا اس کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کا۔ کاندھ کی

ضرورت ہو تو دھڑ دھڑ اس کی کتابیں پھاڑ لیتا، قلم پکارتا چاہے، غصہ کا جھک سا ضرر اسے پڑ سائی میں مصروف دیکھ کر اسے اپنی مصروفیات یاد آ جاتیں، کمرے میں وہ دھماچے کڑی پکاتا۔ صاف کرنے والے کے کئی گھنٹے برہاد ہو جاتے، درخت بچوں کے کام اور گھر کے کمانے پکانے کا کرتے کرتے ہی تھک جاتی تھی، دوسری بیٹی کے بعد اسے اس کی صحت کچھ گرتی جا رہی تھی، ملائے کی ایل ایچ وی سے دو الی جاتی، کچھ دیر کو فرق پڑ جاتا لیکن ہماری کام کرنے سے گردے کی جگہ بہت درد کرتی تھی اسی لیے ستائی سحرانی کا سارا کام غصہ کے سر تھا، کالج جانے سے پہلے ضروری ضروری سمیٹ جاتی مارتے ہی گمراہ لگتا تھا، ہر جگہ درختی کی چیزیں، جو کمرے کی حالت تھی وہ تو اسیاں، وقت کی کمی کا یہاں اس نے اس خوف سے نہیں رویا۔ وقت نکالنے کے لیے اسے کالج سے نکلوا لیا جاتا۔



ایک دن منور چاہی کوئی خیال آیا تھا تو وہ بھی اس لیے کسی دن سے دیکھ رہی تھیں کہ وہ کالج سے تھکی جھکی آتی ہے۔ کمانا کھا کر کام میں لگ جاتی ہے، کئی بار محسوس کیا اپنا اتھا، کن ٹیپاں پہروں سے آہستہ آہستہ سہارا دی ہوتی تھی۔

”تھک گئی تو رہنے دے، ظہر کر ہو جائے گا۔“ اے ہی لگ جاتی ہے۔
اس نے فوراً ہاتھ نیچے کر لیے۔

”نہیں چاہی، ویسے ہی بس۔ شام کو تو پڑنا بھی ہوگا۔“

”ایک تو تجھے پڑنا لے لو، بگا۔ استہجج ایسے پڑھتے پر، جہاں میں سر دیکھنے لگے۔“

غصہ نے استہجج اپنے سر درد پر بھیجی اور کام میں لگ گئی، اس کے شوق پر وہی جگہ بھی تھا تو درختی سے چاہی نے کہہ دی دیا۔

”لگتا ہے تو گھر میں رہنا بھول گیا۔“ تجھے اسٹیل بھوا دوں۔“

اس نے ناگہی سے ماں کو دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

”مطلب کیا۔“

انہوں نے فرش سے گھری چیزیں اٹھاتے ہوئے اسے گھور گھور دیکھا تھا۔

”جہاں بیٹھا وہیں کھایا، ادھر گرلا ادھر گرا۔ کپڑے جوتے چادر سب بکھیر رکھا ہی، کوئی عقل ہی چیز ہے تھ

میں یا گھوڑوں کی طرح گھاس کھائی دم ہلائی۔“

ہاں کی ضرب ایشال پر تو کھول کر رہ گیا۔

”گھری عورتیں مر گئی ہیں کیا۔ کریں کام۔“

اس نے ہاں ہٹا کر تنگسایہ پر اچھال دیا۔

”مری نہیں، بوڑھی ہو گئی ہیں۔ نہیں دم رہا اب ہڈیوں میں اتکا، خواہ تو لو کا گندہ میٹھوں۔“ اس کے بیڑے سے

ٹنگٹھا اٹھاتے اسے ایک بار بھر غرت سے دیکھا تھا۔

”جو جوان ہے اس سے کہیں نہیں کروا تیں۔ بٹھاؤ گھر اسے، بلا وہ چٹا شالہ رکھا ہے۔“

گردن جھکے ہوئے گرم منظر گردن کے گرد لپیٹا، داخنوں تلے آئے کڑوے بادام سیما منہ بناتے کرے

سے باہر نکل گیا تھا۔ در پیچے کے آخری کونے میں اگلیٹھنسی کے پاس ٹیلی وہ لیل لی کر اپنا سٹی یا در رہی تھی،

اگلیٹھنسی کا سارا سیک در غزنی میں بھر گیا۔ دانت کچکا اس کے قریب ہوا اسے اور اس کی کتابوں کو غفر سے دیکھا

تھا۔

”کیا سمجھتی ہے، چار قسط چھ کر ہم پر حکومت کرے گی۔“

ہیز آنکھوں میں ساری ہے بکسی اترا آئی تھی۔

”حکومت کرنے کے لیے تو حمایت کا ہونا ضروری ہے۔ میرے ساتھ تو کوئی حمایت نہیں۔ میں تو خدمت

کرتا چاہتی ہوں۔“

”ہونہ خدمت۔ خدمت تو تھ سے ایسی لوں کا خون کا تھروں کو دیکھو کچ کر دئے گی۔“

وہ اس کی چکی کو ٹھوکر مارتا باہر نکل گیا ہاوس میں ڈوبی ہیز آنکھیں اس کی پشت دیکھتی رہ گئی تھیں، ہیزہ سر کا

در پیچے کی جالی سے دکھائی دیتے ٹھٹھ سے خالی آسمان پر ٹھہر گیا۔

”خواہشوں کو تحلیل کا رنگ تو اللہ جہ عطا ہے، انسان کی کیا وجہت۔“



ہنر چوں پر پُپ پُپ برس کر پُسلنی پُسلنی کی طرح دن سنگار چہروں میں جذب ہوتے جاتے تھے، سال اول کا نتیجہ بہت زبردست رہا تھا، سطحیوں کی آنکھیں بھیل گئیں، استادوں کا مان بڑھ گیا تھا۔ جہاں بخت کی امید بڑھی تھی وہاں سرکار و بھی بڑھ گیا تھا، عرصہ سیارہ پر کھسے سفید لفظ کمر کی طرح مٹنے مٹنے لگتے۔ آنکھیں چہرہ چہرہ صبا کر غور کرتی، کن غلوں پر زور پڑتا، ہار ہار نشست سے اٹھ کر جاتی، کاپی پر اتار لاتی۔ ایک دن مں نے کہہ ہی دیا۔

”بخت احمیں آنکھیں چیک کر دانی چاہئیں، تمہاری نگاہ کا مسئلہ ہے۔“

”نہیں نہیں مں۔“

اسے مں کے چلنے سے بھی غریب آیا تھا۔ صرف یہ سوچ کر کہیں یہ کی نہ ہو جائے، مگر تو گھر والے اس کی کسی صورت نہیں مانیں گے۔ رات کو خالی پیچ کرے کا بلب جلانے نہیں دیتی تھی۔ اسے روشنی میں غیہ نہیں آتی تھی ناں، چاہتی کبھی تھی۔

”رات کو پڑھ پڑھ کر تیرے بال گدے ہیں، چنیا آدمی رہ گئی۔“ دانی کہتے ہیں مگر میں دکھائی نہیں دیتی، ان کتابوں نے میرا کچھ بھی نہیں لیا، زرد بخت کو کون سا پسند ہے دیر تک ہر سچے کا زبرد پاور بلب جلانے رکھنا، تھوڑی روشنی نے نگاہ پر اثر اٹھا شروع کیا تھا، دروغی کے تو کہنے ہی کیا، تو چاہتا تھا بھلے اندھی ہو جائے، مگر تو گے کی۔ بخت نے دعائیں مانگی شروع کر دیں۔

”اللہ امیری آنکھیں تھیک رکھنا۔“

کبلی کے کئی سال سے چیک لگی تھی اس نے اپنی اتار کر دی۔

”بخت ایہ نگاہ کر دیکھ، کج نظر آتا ہے تم کو؟“

ہر ایک کمانی کی چھوٹی سی ٹیک، لیکن ناک پر عاتے ہی لہر لہر کے لیے تو پھر سا آیا تھا۔ جھکے سے آنکھیں بند ہوئیں، پھر کھولیں، بالکل کج تو نہیں لیکن کج سکون ملا تھا غامس کر دائیں آنکھ کو، ہو سکتا ہے دونوں کی دائیں آنکھ کا

نمبر ایک ہو، کچھ دیر لگا رکھنے کے بعد جب اسے لوناٹی تھی تب سر سے کی اہمیت کا پتا چلا تھا، آنکھ شدت سے چاہ رہی تھی اسے اس سر سے سے دیکھا جائے۔ ٹخنوں نے پلوش سے پوچھ ہی لیا۔

”یہ کتنے کی ہے؟“

”پھرے ہزار کی، میرے دامی کتہہ موڑ والے عینک ساز کے پاس لے کر گئے تھے، تم بھی اسی کے پاس چلی جانا۔“

”میں دامی سے کہوں تو شاید وہ مجھے بھی لے جائیں، عینک تو لگ جائے گی مگر اور بہت کچھ بچھن جائے گا۔“
سندھری ہونٹ کھلتے اس نے دل میں سوچا تھا۔

کوئی اور تہہ نہیں تھی اس درد سے چھٹکارے کی، دو دن بعد اس نے پلوش سے ہی کہا تھا۔
”اے یہاں نہیں ہو سکتا۔ تم اپنی عینک مجھے دے دو، میں تھوڑے تھوڑے کر کے پیسہ دے دوں گی۔“

اس کی اعتقاد نہات پر پلوش نے قہر سے سے دیکھا تھا۔

”ہر کسی کا الگ نمبر ہوتا ہے، تم عینک کرواؤ۔“

”نہیں مجھے اس سے کچھ رکھانی دے دیا تھا، میرا بھی نمبر ہو گا، تم اور خواہی رہا۔“

پلوش نے کچھ دیر سوچا پھر پچھلی وقت اتار کر اسے دے دی۔

”میں دامی سے کہہ دوں گی میری نوٹ لگی۔ یہ تم رکھ لو۔“

درد کی بھجوری نہ ہوتی وہ کسی کسی کی چیز میں نہ لیتی، خود کار پٹھان تھی لیکن کیا کریں عالم درد کا جو بعض اوقات خود داری پر چھا جاتا ہے، اس نے کچھ کر عینک ایک میں رکھ تو لی اب لگانا کون سا آسان تھا۔ ایسی چیز تو تھی نہیں۔ گلے میں پہنے دوپٹے سے چھپائے رکھتی، یا بازو پر باندھ لیتی، پھر بے پروائی تھی، دن میں جیسے جیسے چند ہی آنکھوں سے گزارا کر لیتی تھی مگر رات کو جب سب اپنے کمروں میں ہوتے وہ عینک جھا کر چھتی، کسی آہٹ پر عینک میں اس عینک کی آنکھ بچھوئی کو تیسرا دن تھا۔ وہ اپنے چڑھنے میں مگن تھی۔ سر روز لالہ کسی کام سے باہر نکلا اس کے عینک جی دیکھ کر ٹھک سے گئے۔

”یہ کب لگی؟“

وہ جلدی میں چسپا بھی نہ کی، ہنسی رنگ چہرے پر چھا گیا تھا۔

”پلوشکی ہے۔“

”تم نے کیوں لگا رکھی ہے؟“

”وہ مجھے۔ اس سے..... گنج نظر آتا ہے۔“

اس کے حقوق گل گل کر کہنے پر لہو ہر داسے دیکھتے رہے، اپنی گرم ہاؤس گنج طرح سے لپٹی ایک کرسی کھینچ کر اس کے پاس ہی بیٹھ گئے۔

”اگر اتنا مسئلہ تھا تو کیا بتانا نہیں چاہیے تھا، اس طرح کسی دوسرے کی ٹیک لگا کر حریف خراب ہو گئی تو؟“

”جیسے بتاتی اس نے ایک ہی بات کئی تھی۔“ اس کے لہجے میں یک لخت نمی کھل گئی تھی۔ ”پڑھنے سے ہولی

جس، مریخ کو پڑھائی کو نہ

”فلا بھی نہیں ہے پتا تھا پڑھ کر کیا کرو گی بحث۔ ہم پہاڑی لوگ ہیں ہمیں پہاڑوں میں رہنا ہے۔“

”ہاں۔ لیکن ہم پہاڑ تو نہیں ہیں، انسان ہیں، ہمیں پہاڑوں میں ہی راستے بنانے ہیں۔“

اس کے طوس اعداد پر وہ کہہ دیا اس کا چہرہ غلطی کر رہا تھا گھرانے کی کسی لڑکی نے کبھی ایسا سوچا بھی نہ ہوگا جبرہ کہہ جاتی۔

”مجھے سمجھ نہیں آتی بحث، تم میں پڑھائی کا اتنا جہولن کس نے بھروسہ کیا۔“

”لیکن مجھے سمجھ آتی ہے لال۔“

توقف کے دوران ہونٹوں کو کھاتی بہت دود سے بولی تھی۔

”سمیرے باپ کی خون میں لت پت میت نے، میری ماں کے ناخن سلاخ جیسے آنے والے لنگ نے اور میری بہن کے روزاٹھنے والے دود نے۔“



سچی چہرے کی بیز آنکھیں لال پانی میں حیر دی تھیں، جس میں جمال خان کا خون میں انتھرا جسم کراہ رہا تھا، پہاڑی لوگوں کی غامغانی و خشنی کی داستان ایک معمول کی بات ہے۔ وہ بھی اسی معمول کا فکار ہوا تھا۔ پہلے دادا

اس خاندانی دشمنی کی بھیٹ چڑھا پھر جمال خان مالاکنڈ مرزا مہاراج انسان تھا۔ جس کا معاملہ پھر کسی وقت پر اٹھا رکھتے ہیں۔ کیسے سلجھ ہوئی کتنے لوگ اس کی بھیٹ چڑھے کتنا سرمایہ لگا، کون کون سی زمین کی، لیکن فی الوقت جمال خان کی جان لہوں پر تھی ناگ پر اور کر کے نیچے چار گولیاں لگی تھیں، ناگ والی تو گوشت کو بھاڑ کر غروی نکل گئی۔ مرہم پٹی قرعہ ڈھنڑی میں ہو گئی لیکن کمر والی گولی ہڈی میں اک لگی تھی جسے نکالنے کے لیے ہاتھ سدا آپریشن کی ضرورت تھی۔ ڈھنڑی میں نہ تو آپریشن تھیز نہ تھی کوئی سرجن۔

یہ اک کے قریب ہی کامرہ لواتی علاقہ تھا، گاؤں اور شہر کو ملا کتبہ موڑ اب اتنی دور بھی نہیں تھا یہی کوئی تیس سے چالیس منٹ کی ڈرائیو پر، وہاں ڈاکٹر بھی تھے ہسپتال بھی، کچھ وقت ڈھنڑی میں رہا ہو گیا تھا، کچھ تیس چالیس منٹ کا فاصلہ طے کرنے میں، اس سے پہلے کہ جمال خان کے قدم ہسپتال تک پہنچے، اس کے سروں سے روح نے قدم باہر نکال لیے تھے۔

جنت کی مراعاتی نہیں تھی کچھ کچھ تھے، لیکن لوگوں کے دین نے سمجھا بہت آسان کروا تھا۔ پلوٹہ کی ماں ہار ہار کہہ رہی تھی۔

”خانہ خراب، ڈھنڑی والا کوئی نکال دیتا تو اتنا خون شائع نہ ہوتا۔“

”مزے (ارے) بتایا تو ہے، ڈاکٹر یہاں نہیں ہوتا۔“

”جو تھا پاگل کا باچہ (بچہ) کہہ خود نکال دیتا، ڈاکٹر ضروری ہے؟“

”اے لیکن، گولی بولا ڈاکٹر نکال دیتا ہے ڈھنڑی میں۔“ □

”اور تو گولی ڈاکٹر نکال دیتا ہے۔“ جنت کے سبب ذہن نے ایک بات بھی ہی کہ چاہی نے ایک سفید چادر لاکر بہت دیر سے سکتے میں ٹیلی خانی ٹیکم کے اوپر ڈال دی تھی پھر جو خانی ٹیکم کا سٹوڈنٹ تھا، اس کی جینس آج بھی جنت کے کانوں میں گرم سلاخ کی طرح ٹھس رہی تھیں، غم چکوں کے سائے میں ماضی ابھر کر مصدم ہوا ملزاتی ٹیکس، اٹھا کر اس نے امروز خان کو دیکھا تھا وہ ستاسٹا مینوں میں سے مسلسل اسے دیکھ رہے تھے۔

”گالہ ابھرا پ گولی نکلنے سے نہیں مرا تھا، گولی نہ نکلنے کی وجہ سے مرا تھا۔ اگر ڈاکٹر ہوتا، شاید ابھرا پ بھی ہوتا۔“ سبز جیل سے پانی گلابی رخساروں پر چھلکا۔ ”سب کچھ ہے میرے پاس، محبت، شفقت، خیال، پیار لیکن

میرے دامی نہیں ہیں۔" ایک منظمی سکاری ان سندری ہونوں پر دم توڑا، چڑے غم ہو کر بھاری ہونے لگے۔
 پہلے باپ سخت گیر ہو کر اس کا ہونا ہی نہیں کے لیے اتنی جھٹ جیسا ہے اور جھٹ کو اپنی جھٹ نکلوں کی گئی تھی۔
 "اور لالہ مراد میرا باپ تھا، سفید کفن میری ماں پر کیوں لپیٹا تھا، میری ماں کی وہ ٹھیلیں، میرے باپ کے
 غون کے قطرے میرے اندر جنوں بھر رہے ہیں، مجھے ڈھنری میں ڈاکٹر بن کر بیٹھنا ہے۔ کسی اور کی ماں سفید
 کفن نہ لپیٹے بہت درد ہوتا ہے بچوں کو ماں کی چیخوں سے، باپ کی موت سے۔"

اس کے لہجے کی نمی سے امروڈ خان کے دل کو دھکا سا لگا تھا۔ دل گرفتگی سے اٹھتے اٹھتے اس کے سر پر ہاتھ
 رکھا۔

"جھٹ بچہ پر سب نقد بر میں لکھا تھا، ہونا ہی تھا۔"

"نقد بر کون لکھتا ہے لالہ؟"

وہ یک لخت ان کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔

"اللہ لکھتا ہے ماں نقد بر تو بھر اس نے جنت دوزخ کے راستے کیوں بتائے ہیں۔ نقد بر میں تو لکھا گیا ہوگا
 نکلاں برا ہے، وہ دوزخ میں جائے گا۔ جس کو اچھا لکھا اس نے نیکی کرنی ہی کرنی ہے۔ پھر جنت، دوزخ کے
 حصول و بچاؤ کی محنت کیوں۔"

امروڈ خان کی تاسفانگ ہیں اس کے چہرے پر بھی جاری تھی۔

"نہیں لالہ۔ نقد بر میں بہت ماحصلہ تدبیر کا بھی ہے اور میں صرف تدبیر کی کوشش کر رہی ہوں۔ نقد بر کو رنگ
 اللہ نے چھانا ہے۔"



مشکلات ضرور تھیں لیکن اس کی کوشش رانجیاں نہیں جاری تھی، ماحولان نزدیک آ رہے تھے، محنت بڑھتی
 جاری تھی، امروڈ خان پہلے ہی اسے کتبہ سوز کے ڈاکٹر سے میٹک لگوا لائے تھے، پلوشکی والہیں کر دی تھی، میٹک کا
 بھی عجیب ہی قصہ تھا حدود و احتیاط کے باوجود ٹوٹی ہوئی ملتی تھی، خانی جیکم انگ ڈاکٹر، چابی انگ لاہروائی کے
 طے دیتی، ملتی بھی ایسے جیسے فیصے میں بکلا کر دوہری کی گئی ہو، یہ آج تک چنانچہ مل سکا میٹک پر قصہ کون نکال دے،

جب کہیں دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے اٹھی، ٹوٹی ہوئی جلی، فحش نے آخر سے ڈوری باغیچہ لی سوتے ہوئے گریبان میں ڈال لیتی، جبکہ محفوظ ہوگئی، درخت کی کاغذیڑ سے لگا۔

اعتر کے استقامت کا شیڈول جاری کر دیا کیا تھا، بچوں کو کالج سے فارغ کرتے ہوئے استادنوں نے پارٹی دی تھی۔ سب بچیاں کئی قسمیں سوائے فحش کے تھیں۔ استادنوں کی چاری کرنا تھی بہت اچھی چاری اور چاری اس کی اچھی ہی تھی۔ استادن شروع ہوئے اسے اسی بات کی خوشی تھی مرکز قریبی، حال وقت بھی صبح کا، بچہ دے کر بہت سا ناختم مل جاتا۔ جس طرح سے وہ بچہ دے کر آ رہی تھی اسے یقین تھا سال دوم کا نتیجہ سال اول سے بھی بہترین ہوگا۔ بات ایف ایس سی پر ہی تھوڑا ختم ہوتی ہے UHS (یونیورسٹی آف ایلیٹس سائنسز) نے میڈیکل کے داخلے میں طلبہ کے قدم سے بھی لڑائی رکاوٹ اعتری ٹیسٹ کی لگا رکھی ہے، پڑھے لکھے خاندان، یا شہروں میں رہنے والے پھر اس بات کو کسی حد تک سمجھتے ہیں کہ اعتری ٹیسٹ کی چاری کے لیے بھی کسی ادارے میں جانا پڑتا ہے، لیکن جن علاقوں میں میڈیکل کی تعلیم ہی نہ پاتا ہوں وہ اس بات کو کیا سمجھیں۔

”مڑے (ارے) تم تو کہہ رہی تھیں، ہمارا ہوس کی کتابوں سے پرچہ آئے گا، وہ پڑھ تو لیں اب کیسی چاری۔“

خانی بیگم حیران تھیں، چاہتی تھوڑی دیر تھیں۔ فحش ان خصوصیات کو اپنا فرسودہ نظام تعلیم کیا سمجھتی، ایف ایس سی کے اعداد استاد جو حصہ یہ کہہ کر پھڑک رہے ہیں، ”بچہ ایہ پھر پھوڑ دو، اس میں سے کبھی بچہ نہیں پڑتا، پچھلے پانچ، چھ سال کے بچہ رد کیے، یہ سوال نہیں ملیں گے، باقی کی چاری کرو۔“ اور وہ ہی ایف ایس سی کا مشکل ترین حصہ میڈیکل کالج کے اعتری ٹیسٹ کا پھوڑ ہے، دو سالوں میں استاد وہ مشکل حصہ پڑھانے سے گھبراتے ہیں۔ UHS یہ جانتی ہے بچہ نوے دن کی چاری میں وہ انگلیوں کی پوروں پر کسی روٹ کی طرح یاد کر لیں، سلوٹ ہے اس دور کے بچوں پر وہ پھر بھی کر لیتے ہیں۔ کرنا فحش بھی لے گی مگر اسے اس ادارے تک جانے کا رستہ تو ملے۔

ایم۔ کیٹ (میڈیکل کالج اعتری ٹیسٹ) کی کلاسز تمام کوچنگ سنٹرز میں پھوڑے اگلے دن ہی شروع ہو چکی تھیں اور میڈیکل کے تئنائی بچے دھڑا دھڑا اس میں داخلے کر اکیڈمی مانڈا کی ہاڑی بھر رہے تھے، ایک تو

کامروانک کا نواحی علاقہ، پھر گمروانوں کو قائل کرنے میں اسے چند دن لگ گئے تھے۔ امرود خان اس کے شوق کے آگے ہار گئے تھے انہوں نے ہی دامی کو قائل کیا تھا۔

”ایک مینے بیکل کالج برائے خواتین بھی ہے قاطر جناح مینے بیکل کالج۔ ہو سکتا ہے اس میں نام آجائے، آج کل سب کی لڑکیاں پڑھ رہی ہیں اور اس کا شوق ہے، ہمیں دیکھا نہیں جتنا چاہیے دلتی۔“

اگر شوق کو راستہ گمروالے خدیں تو وہ جنون بن جاتا ہے، جنون بہت سی کا دوسرا نام ہے، دامی کو قائل کر کے اسے بہت سی سے امرود لالہ نے بچا لیا تھا، انہوں نے ہی ایک دین کا انتظام کیا جو اسے ایک شہر کی اکیڈمی تک لاتی لے جاتی، دن تو بہت گرم تھے مگر پہاڑان کی گرمی کو کسی حد تک جذب کر لیتے تھے اس نے دن رات محنت کی تھی۔ ساری تیاری مکمل تھی، سردی دے کر دن کا اعلان ہو چکا تھا۔



معمولاً اکیڈمی ”بیٹ آف کب“ کا واسطہ ہوتے آخری دن کی چٹائی دے دیتی ہے، تاکہ بچے دلکس ہو کر اپنی جاری کو قائل کچھ دیں گیں۔ اس نے ساری رات پڑھا تھا، فجر پڑھ کر کچھ دیر کو سوئی، سو رنج اونچا ہوتے ہی اٹھ گئی۔ آج اکیڈمی نہیں جانا تھا کیونکہ بیٹ آف کب آؤنا تھی۔ سارا دن اپنا تھا، آٹھ گھنٹے ہیں، دو سال کی محنت ایک طرف اس ایک دن کی محنت ایک طرف، وہ ناشتہ کرتے ہی کتابیں لے کر دوپٹے میں بیٹھ گئی، دامی اور امرود لالہ اپنے کام سے باہر تھے، کچھ ہی دیر میں گھن کے کچھ دوپٹے دھلائی آداریں بلند ہونے لگیں۔ اس نے دو تین بار ناگوار سے دیکھا تھا۔ دو غزلی گمر کا سینہ دروازہ آٹھ گھنٹے جانے اس میں کیا ٹھوک رہا تھا چاہی سربہ روپہ ہاؤسٹی ہوئی اسے پوچھنے آئی تھیں۔

”کیا ٹھوکا ٹھوک لگا رکھی ہے، ہمارا سر پہنچے کو ہر گیا۔“

”دروازہ خراب ہو رہا ہے، دو ٹھیک کرنے لگا ہوں۔“ کہہ کر اس نے چوکی قوت سے پکی لکڑی پر تھوڑے برساتے شروع کیے، ٹھیک ٹھاک آ کر ٹھوک کے آئی تھی اور بہت تھی اعزاز میں بولی تھی۔

”خدا کے واسطے کل ٹھیک کر لیتا۔“

”اچھا تاکہ گمر میں چور گھس آئیں، دیکھا نہیں، دیکھنے لگا ہے۔“

اس نے آری کے ساتھ دروازے کا ایک حصہ کٹا لگ کیا اور پکی کھڑی کا ٹکڑا اٹھا کر انھیں اس میں گاڑنے لگا۔

”ایک دن سے کیا ہوتا ہے کہیں نہیں دیکھ کھا جاتی۔“

جشتہ کی منٹوں پر اس نے اس کو استہزائیہ دیکھتے کہا تھا۔ ”دیکھ رہا ہے، دیکھ ایک دن میں واقعی نہیں کھاتی۔ ہونہ۔“

اس نے گردن جھٹک کر پہلے سے بھی زیادہ قوت سے ہنسنے شروع کیے، جشتہ نے جا کر کمرے کا دروازہ بند کر کے اسیلیاں کانوں پر بھائی تھیں، اسے اپنی بے بسی پر بہت رونا آیا تھا اسے وہ سب لڑکیاں یاد آنے لگیں چوروز کتنی تھیں۔

”میرے دانی نے آج کل گھر میں مہمانوں کی آمد پر پابندی لگا رکھی ہے۔ میں ڈسٹرب نہ ہوں ہاں۔“ کوئی کہتی۔ ”سورے (مال) بھرنا بہت خیال کرتی ہے، ہادام اخروٹ، دودھ کے ساتھ دیتی ہے۔ پڑھ پڑھ کے سر دیکھ لگتا ہے ہاں۔“

اور جشتہ کے سر پر ہنسنے سے پہلے ہی ہنسنے سے بچنے میں گھسنے کی آواز سارے گھر میں گونج پیدا کر رہی تھی۔ اسی گونج میں اسے جاری عمل کی تھی اور وہ کبھی رتی نمی۔ سورج کی آخری کرنیں چھروں میں دفن ہونے کو تھیں۔ اسی ٹھک ٹھاک میں اس کی تقریباً ساری دیر گزرتی ہو چکی تھی۔ صرف فزکس کے نو مہر نکل (Numericals) جو محنت طلب بھی تھے اور توجہ بھی چاہتے تھے وہ اس نے رات کے لیے چھوڑ دیے تھے، ظاہر ہے جب تک دروازہ ٹھیک ہو جاتا تھا اور شور مچا جاتا آرام سے سو جاتے تھے، ایک تو اس بات کی کچھ نہیں آتی میڈیکل سے فزکس کا کیا تعلق ہے، یکسٹری تو بھر کھاتی ہے، ایم بی بی ایس میں پہلے کم گھر سطر ساتھ رہتا ہے، لیکن فزکس۔ اور بھر سٹپس میں اس کے نو مہر کھو؟ ظاہر ہے، ہمارا فلسفی مانگا جو سرکار کے اونچے عہدوں پر فائز ہے، اس نے اپنے ہارمونٹ میڈیکل کالج بھی تو چلانے ہیں، گورنمنٹ کالجز کے آگے ہر لگے قواربوں کی آمدن سے ان کے بچوں کی روزی روٹی چلے گا ہمارا بیاراسٹم!



دردنازہ ٹھیک ہو کر لگ چکا تھا، درد و بیمار سے گونج ختم ہوئی تھی مگر میں یک لخت اندھیرا چھا گیا۔ اس نے دردنازہ سے باہر درخونی کو جاتے دیکھا تھا اور بس اندھیرا، مگر کی ساری ہتیاں چمک کر گئیں، کچھ کچھ نہیں آئی تھی لائٹ کو ہوا کیا، دانی گھرا آچکے تھے۔ امروز خان نے سوچ چمک کیے، یہی سمجھ آئی تھی شاید دائرنگ ازنگی، دانی نے تو کہا بھی۔

”تم مگر میں تھا کسی کو دکھا دیجئے۔“

”دانی اجڑا ہوا ہے ابھی ہوا ہے ہمیں کیا ہوا دائرنگ غراب ہوا یا بجلی چمپے سے گیا ہے۔“

اللہ تو بہر حال جانتا ہی تھا غصہ کو بھی پھرا یقین تھا درخونی کا کچھ ہاتھ ضرور ہے اور واقعی اس نے میٹر سے سہائی تار چمکے سے کاٹ دی تھی۔ مگر میں ایک دو بیڑی تھی۔ کوئی لے کر کمرے میں جا رہا تھا، کوئی ہاتھ روم یا کچن میں، غصہ نے امروز لالہ کے سوا ہاں کی تاریخ آن کی۔ سوا ہاں منہ میں دبائے تو میرے کھول کیے تھے۔ اس کی آنکھوں میں لالہ کرا تا پانی اور دل کی دھڑکن واضح کہہ رہی تھی۔

”درخونی اتھا رہے اندھیرا کرتے سے کہہ نہیں ہونے والا، بس میرا اللہ اندھیرا نہ کرے۔“



حسن سے چور دات ختم ہوئی۔ سید اوزن طلوع ہو چکا تھا، مغربی ٹیسٹ کے مرکزی سنٹر کا بحر پر راز چا اپنے نازک کندھوں پر اٹھاتے بچہ گردہ در گردہ تھے، تیار، نو ٹیسیر، چیرتھی سیڈ بکل کپ، اور ماں باپ کی تسلیاں۔ چونتیس سو سیٹوں کے لیے اس ملک کے ذہین ترین ساتھ چڑا چہ ٹھکرا اور تھکے رنگ دیکھنے لگا تھا۔ ہر طبقے کا بچہ تھا۔ غصہ نے مرکز میں قدم رکھنے سے پہلے ایک لگا دھا کرا سنان کی جانب دیکھتے ایک بات سوچتی تھی۔

”نہیں بدل سکا کوئی اسے، اگر میرا بپ ارادہ کرتے۔“

ہمیں وقت سے پہلے چاہے ہوتا ہے لیکن رب کے ارادے وقت پر رنگ دکھاتے ہیں، رب کے ارادے کا رنگ چڑھنا شروع ہو گیا تھا۔

حسب روایت مشکل سے مشکل ترین بھی مخصوص وقت میں مل کر کے دو بہت پر امید واپس لوٹی تھی۔ شام تک میٹ پر آنسری (درست جواب) بھی آنجکی تھی اور پچھلے سالوں کے میرٹ کے حساب سے بہت اچھا

انگریٹ بنا تھا۔ کبھی دو تین سال پہلے آنسر کی آتے ہی فیصلہ ہو جاتا تھا، کون کچھ میرٹ پر سلیکٹ ہے کون ریجنلکٹ، لیکن اب ڈیپن بچوں کی بددستی تھا اور محدود سیٹوں نے میرٹ میں اتنے بڑے بڑے اپ سیٹ کئے ایڈمیشن لسٹ کتنے سے پہلے کہتا ہی مشکل ہے میرٹ کہاں ٹھہرتا ہے اور میرٹ بننے کے مراحل اور لسٹ کتنے میں لگ بھگ دو ماہ کہیں نہیں کئے اور ان دو ماہ میں باقی تمام یونیورسٹیز میں نہیں جمع ہو کر داخلے بند ہو چکے ہوتے ہیں۔

کیا خوب کیونکے پانی ہے ہمارے اداروں نے کر میڈیکل لسٹ سے ریجنلکٹ ہو جانے والے ہزاروں ڈیپن بچے کہاں جائیں گے؟ کیا ان کا یہ جرم کم ہے، ذہانت کی بنیاد پر انہوں نے میڈیکل کا شعبہ چنا۔ کیوں چنا؟ یہ اب ان کی سزا ہے، اور کتنی ذمہ دار قوم ہیں ہم، اپنے آنے والے بچوں کے لیے علم اٹھانا تو کیا، علم بکھانا بھی چھوڑ رہے ہیں۔ خیر یہ خلک قصہ بھر کسی وقت پر اٹھا رکھانی الوقت قصہ ہے۔ ایک پہاڑی ٹیچر کے ڈاکٹر بننے کا، ٹیچر کی نقد پر تہہ کا رنگ چڑھ گیا تھا جب میڈیکل کالج کی لائسنس لیں۔ اپنا مکمل نام بتا رہے تھے، شہریت، اسحقانی کارکردگی کے ساتھ راولپنڈی میڈیکل کالج کی لسٹ میں جگہ کا تا دیکھ کر وہ اندر حاد حد بھاگتی آئی تھی۔ غشی سے جان ہولے ہوئے لڑ رہا تھا اور سب آکھیں تم بولان کی جانب بڑھتے اس کے قدم دانی کی آواز پر ختم کئے تھے۔

”امروز خان! تم تو کہتا تھا اس کا داخلہ لوگوں کے کالج میں ہو جائے گا، لیکن چڑی کے کالج میں تو لو کے ساتھ چڑھتے ہیں۔“

”ہاں دانی انبر تو اس کے بہت تھے، میرٹ اس سال اور اوپر چلا گیا۔ کیا کیا جاسکتا ہے۔“ یعنی کما مرود لاہ اس سے پہلے میرٹ لسٹ چمک کر چکے تھے۔ ہونا تو ٹیچر کو خوش چاہیے تھا لیکن صورت حال کچھ اور بن رہی تھی۔

”کیا مطلب ہے۔ کیا کرنا ہے۔“

امروز کے جواب پر درختی پورے کور سے تڑپ کر اٹھا تھا۔ ”اب ہم اتنا بے فیرت ہو گیا ہے، اسے لوگوں کے ساتھ چڑھتے بھیجیں۔ مٹھا گھر میں درندہ بھاگ جائے گی وہ کسی بے حیا کے ساتھ۔“

سننے ہی غصہ کے پاؤں زمین پر ایسے چپک گئے تھے جیسے پتھریں گاڑ دی گئی ہوں، اس نے قلم بھری نگاہ سب پر ڈالی تھی، غنائی تنگ سر پہلے بٹھی تھیں، چاہتی انگلی گال میں گاڑے درخزئی کی ہات پر غور کر رہی تھیں، شروع سے دیوار پر بخت کو تو بھاگ جانے کے خوف سے پیدل آ گیا تھا، امرود لالہ، دلی چپ تھے، کبھی کبھی ہماری جگہ میں ہمارے ماں باپ بھی ساتھ کھڑے نہیں ہوتے، حالات سے ڈر جاتے ہیں، اس کے ساتھ بھی کوئی نہیں کھڑا تھا، اسے خود کھڑے رہنا تھا۔ اپنے لیے خود لڑتا تھا۔ وہ قدم اٹھاتی ان کی جانب بڑھی، قدم اس قدر ہماری تھے اسے لگا زمین اس کے قدموں سے چپک گئی ہو اور ہر قدم پر ساری زمین اس کے ساتھ گھسٹ رہی ہو خوشی سے لڑتا بدن خوف میں داخل کیا تھا مگر اس نے اسید نہیں چھوڑی تھی۔ اس نے اپنے قدموں میں جان پیدا کی، آواز پر قابو رکھا۔

”دامی امیں پہاڑوں کی بیٹی ہوں۔ پستوں سے بچنے کے لیے، اونچے اونچے راستوں پر مجھے جہاں قدم رکھتے آتے ہیں۔“

سب نے ہی جھپک کر اس کی جانب دیکھا تھا۔ درخزئی تو ایسے دیکھ رہا تھا، جیسے ابھی چر پہاڑ کراسے پستوں میں بیٹھ دے مگر وہ جتنی انداز میں دامی کو دیکھتے کھینچ رہی۔

”جو خود کھائی سے لڑتی ہو، وہ اپنے دامی والا کو کمرے دے گی؟“

اس کے سوال کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا سوال بہت عجیب تھا، وہ جواب دیتی رہی قائل کرتی رہی اور آخر جب کچھ بات اپنی نظر نہ آئی۔ آخری حربے کے طور پر کہا تھا۔

”امروڈ لالہ! مجھے صرف ایک بات کا جواب دے دو میں خدا بچاؤں گی۔“

امروڈ اور سیف اللہ نے سوالیہ انداز میں اسے دیکھا۔ وہ قطعیت سے کہہ رہی تھی۔

”ہم خطیوں کو لڑا کٹر بننے نہیں دیتے، بہت کالی تعلیم ہے، لیکن بھئی کے علاج کے لیے لیڈی ڈاکٹر ہی کیوں اصرار کرتے ہیں، یہاں تک کہ ڈاکٹر کی تلاش میں وہ درو سے روپ کر مر جائے۔“

درخزئی اس کی بات پر استغراب سے جسا تھا، امرود نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے مگر اس کی بات ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

”زوار کا کاکی بیوی تو سب کو یاد ہوگی ایسی بھولنے والی بات ہے تو نہیں۔“

زوار خان پھاڑ کی کھجلی جانب کی گلیوں میں رہتا تھا۔ بہت ٹیک خدا ترس انسان تھا۔ اس کی بیوی زربندہ کو جانے کیا ہو گیا تھا۔ تکلیف ہاتھوں کی معمولی خارش سے شروع ہوتی تھی۔ پھر سارے بدن میں پھیل گئی، خارش کرنے پر چھوٹے چھوٹے دھبہ بن جاتے جن میں سرخ دانے بننے لگے، کوئی چھپا کی کہتا، کوئی چنبیل دانے، ہر غشی سے زردی میں ڈھلنے لگے تھے۔ پہلے گمریلہ علاج شروع ہوا، فرق نہ پڑنے پر انڈوس پڑوس کے ٹوٹکے، تکلیف شدت بکڑنے لگی تو ہات حکیم تک جا پہنچی، زوار خان حکیم کو حالت بتا کر مرہم لے آیا، جتنی دہر مرہم لگا رہتا سکون رہتا۔ جیسے جیسے بحکومت گزرتا خارش میں شدت پیدا ہوتی۔ یہاں تک کہ دھم رسنے لگے تھے۔ کسی نے انک لے جا کر ڈاکٹر کو دکھانے کا مشورہ دیا تھا، زوار نے کئی لوگوں سے چا کر لیا تھا، انک میں اسکن کی کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں تھی۔ مرد ڈاکٹر کو وہ اپنی بیوی کا جسم دکھانے اس سے کہیں بہتر تھا، بیوی مر جائے۔ پھر ایسا ہی ہوا لیڈی ڈاکٹر تو نہ ملی، الہتہ وہ خالق حقیقی کو جا ملی۔

اس کے مرنے سے لڑائی کسی کو نہیں پڑا تھا۔ نہ زوار کو نہ زوار کے گھر کو۔ کیونکہ گھر کی اتھری دیکھ کر وہاں میں ہی زوار نے دوسری شادی کر لی تھی لیکن اس کی دوسالہ بیٹی کی زندگی سارے محلے نے دیکھی تھی۔ عین اوقات کے کھانے کے ساتھ مار پیچہ کسی دوائی کی طرح غوراً غوراً میں شامل ہو چکی تھی، کسی وقت کی غاموش بیٹی کی خدایا پورے علاقے میں مشہور تھی۔ سب کو ترس آ جاتا تھا سوائے زوار کے۔ ویسے بھی مشہور ہے ماں بدل جائے باپ پہلے بدل جاتا ہے۔

مجھ نے جس اعزاز میں کہا تھا امروڑ کی آنکھوں کے سامنے زوار خان کی روتی ہوئی بیٹی آنکڑی ہوئی تھی۔ دانتی چپ تھے۔ درختی کا چپ رہتا، ہمیشہ ہی مشکل رہا تھا، استہزاء، استہزاء، استہزاء بولا تھا۔

”بیاری اور شفا اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، اس میں زوار کا کا کا کیا قصور؟“
 ”شفا اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، شفا کے لیے بھاگ دوڑ بھی اللہ ہی کا حکم ہے۔ اگر علاج کا حکم نہ ہوتا تو علاج کے اللہ طریقے ہی نہ ہوتا۔ کیوں امروڑ لال؟“

اس نے درختی کو نظر انداز کرتے ہوئے امروڑ کی جانب دیکھا تھا۔

”علاج کا حکم ہے۔ اور کیا ہم علاج کے لیے لیڈی ڈاکٹر نہیں ڈھونڈتے۔ بے شک تلاش میں بیماری کتنی بڑھ جائے۔“

امروزی نگاہ میں پشیمانی لہرائی تھی۔ درخت کی گروے کی تکلیف بھی بونہی بڑھتی جا رہی تھی۔ علاقے کی کھانکا کالوجسٹ کو دکھایا۔ اس کا خیال تھا الٹرا سائڈ ہوتا کہ بیماری واضح ہو اور الٹرا سائڈ لیڈی اسپیشلسٹ نزدیک علاقے میں کہیں بھی نہیں تھی۔ بجائے تھا۔ کبھی وقت نکال کر اوپنڈی جائیں گے تو یہ کام بھی ہو جائے گا۔ فحش کی باتوں پر امروزی نگاہ درخت پر گئی۔ کچھ دیر ہی بیٹھے رہنے سے اس کے چہرے پر تھاواٹ کے اچھے خاصے آثار تھے۔ اس کی گود میں لٹھی پھوٹی سی پری پر امروزی نگاہیں گڑی رہ گئی تھیں اور ایک منٹ کا تھا انہیں فحش کی حمایت کرنے میں۔

”تم اپنی تیاری شروع کرو ہم تمہیں جھوڑ کر آئے گا۔“
 دانی امروزی کا چہرہ دیکھتے دیکھتے مگر کچھ نہیں۔ درختی نے بہت شور مچایا۔ یہاں تک کہ مگلی توڑ دے گا۔ امروزی نے اسے ایک بات کی تھی۔

”خواہ تو اس کی خند پر اعتماد لیجئے نہیں کئے جاتے۔“

گھر کا فرد ہاتھ تھام کر چلائے تو خوشی دیدنی ہوتی ہے، فحش بھی بے حد خوش تھی جب امروزی لالہ اور درخت اسے کالج چھوڑنے آئے تھے۔ امروزی نے دو دن پہلے آکر ہوش نگاہ کالج کے تمام داہیات جمع کروا دیے تھے۔ اصل ڈاکوٹنس کیونکہ اسٹوڈنٹ نے خود جمع کروانے ہوتے ہیں اسی لیے کبھی کام رو کیا تھا۔ وہ تجزی سے اپنے من آفس کی جانب بڑھ رہی تھی سامنے سے سینکڑوں ایک بیچ قریب آیا۔

are you first year.....? (آپ فرسٹ ایئر ہیں)

yes

اول تو فرسٹ ایئر کی تصدیق تھا ضروری نہیں اپنی ہونگی سے دور سے دور ہی بچکانی جاتی ہے لیکن فحش نے خاصے احاد سے گردن ہلاتی تھی۔

”وہ نگہ دیکھ۔“

ایک لڑکا جوش سے ہاتھ ملانے کے اعزاز میں آگے بڑھا، جھٹ جھپ کر دو قدم پیچھے ہو گیا۔ امرو خان کی آنکھوں میں یک دم آ جانے والی سرخی اس کی ساتھی لڑکی نے پل میں محسوس کی اور اپنا ہاتھ بڑھاتے مسکرائی تھی۔

”اچھے لی ہم سب فرسٹ ایئر کا ہی وٹ کر رہے تھے، ہم آپ کے سینئر ہیں، ہماری لڑکی ہے آپ کو گائیڈ کرنا، آپ کی کلاس تک لے جانا۔“

جھٹ نے اپنے دونوں ہونٹ اندر کی جانب سمجھ کر رکھے تھے، وہ لڑکی اب امرو خان سے مخاطب تھی۔

”آپ ان کے۔۔۔؟“

”بھائی۔“

”بس بھر بھائی اب آپ بے فکر ہو کر جا سکتے ہیں۔ یہ اصل جگہ پہنچ چکی ہیں، یہاں سے فارغ ہو کر ہم سب ہوٹل چلے جائیں گے، یہ ہمارے ساتھ ہوں گی۔“

امرو خان وہاں سے بچے کو ایک پل بھی دل نہیں کیا تھا لیکن جانا تو تھا ہی۔ جاتے جاتے کئی بار کئی کئی نصیحتیں بھرے دہرائی تھیں۔

”الار! میرے قدم جب بھی ڈنگائے میں وہاں آ جاؤں گی نہ۔“

بچے وہ اندر سے جتنی بھی ڈری تھی لیکن بہت آرام سے امرو خان کی تسلی کی تھی۔

”شبابش۔“

اس کے سر پر چار بھری جھکی دے کر وہ ابھی کے لیے سڑے تھے، جھٹ کروٹن پیچھے رہ گئی، جانا دیکھ رہی تھی جب اس لڑکے نے اس کے ہاتھ میں پکڑی فائل چمکائی۔ وہ ساری گھولی تھی۔

”یہ۔۔۔ بھری ہے۔“ جھٹ کی دلی سی آواز نکلی تھی۔

”اور بچکل ڈاکو متنس ہوں گے؟“ اس نے فائل کھولتے تھروہ کیا تو جھٹ ہاں میں سر ہلاتی رہ گئی۔ جب وہ اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

”تو پراٹھم ہا سے میں سب میٹ کر داتا ہوں، مآپ جائیں ان کے ساتھ مآپ کی کلاس ہے۔“

لیکن یہ تو اسٹوڈنٹ نے جمع کر دئے ہیں۔ میں نے سنا ہے سائن و فیلرہ۔“

اس کے ذریعے لہجے پر سارے گروپ نے قہقہہ لگایا وہ گفت سے سرخ پڑ گئی وہی لڑکا دو بار رو بولا تھا۔

”ہم کون سا کھوتے ہیں۔ ہم بھی اسٹوڈنٹ ہی ہیں بی بی۔ سائن بھی کرتے آتے ہیں۔ بھلے آپ کا نام مشکل سہی مگر لکھ لیں گے۔ ہماری ایجنس سے جان بچان ہے۔ ذرا جلدی کام ہو جائے گا آپ کا۔“

گروپ کی کچھ لڑکیاں ہادی کو رات گوتے و بے ادب انداز میں اشارے کر رہی تھیں۔

”وہ اس کی فائل۔“ ہادی نے واضح کدھے چکائے اور گروپ کو ڈھپ کر بولا۔

”سمیٹرز کیا مسئلہ ہے آپ کے ساتھ۔ انہیں ڈی ایچ لے جاؤ۔ دیر ہو رہی ہے ان کی کلاس کس نہ ہو

جائے۔“

”بہت برے ہو تم ہادی۔“

”اسٹوڈنٹ؟“

”ویس۔“

جس کے منہ میں جوا آنا اس نے کہا اور ٹیڈ کو ساتھ لے کر بھاگ پڑے۔

ہاتھوں کو مسلنے ان کے پیچھے چلے ٹیڈ کو اپنی فائل کی گھر تھی۔

”میرے اللہ میں یہاں آ تو تھی، چتا نہیں یہاں کے لوگ کیا کریں گے۔ دھمکی میں ایک دروغ زنی کم تھا۔“

پاؤں کے نیچے گھاس رو دھتا ہے مگر چتا سمیٹرز کا گروپ سنے حریف ہوا سناں کر رہا تھا۔

”ڈاکٹر بننا آسان تھوڑی ہے، بڑے سر ملے ہیں یہاں، کم از کم پتھری چا تو سے بالکل نہیں ڈرنا۔ خیر ہم ہیں

ٹاں آپ کی مدد کو۔“

اور ٹیڈ کو لگا تھا واقعی اس کی مدد ہونے جا رہی ہے۔ آنکھیں تو بکلی تھیں جب وہ ڈی ایچ ہال پہنچ چکی

تھی۔ ایک عجیب سی بسا ند میں رچا کرہ جس کی چادر بھاری پر شیشے کی کیبن لٹا الماریاں بنی تھیں اور سب میں

انسانی اعضاء کی ہڈیاں مختلف رنگوں کے ساتھ رنگوں اور غلیوں کے ڈائجٹرام سے سجا کر ایسے رکھی تھیں جیسے جیتی

ڈیکوریشن ہوں، کچھ پلاسٹک آف پیس کی گئیں، کچھ اصل، دھتا آنکھوں کی کھوپڑی اور ایک چار میں تیرتی آنکھیں

دیکھ کر تھوک خروغ و زلزلہ میں اٹھ کر گرنا تھا لیکن وہاں پہلے بھی فرسٹ ایئر کے لڑکے لڑکیاں کھڑے تھے جنہیں سینئرز کا ایک اور گروپ عجیب و غریب الجھروے رہا تھا۔ بچے کبھی شرم سے سرخ پڑ جاتے کبھی خوف سے پہلے۔ جھٹکتے بھی ان میں آ کر شامل ہو چکی تھی۔ وہ جہاں کھڑی تھی اس کے آگے ایک بڑا سا اسٹیل کا پٹی لٹا ہوا چوڑا ڈھانچا سا رکھا تھا اور ایسے سے اس ہال میں کئی ڈبے تھے۔ انہیں دیکھ کر وہ بھی تاثر آتا "میڈیکل کالج کے ڈائیکٹری کے بجائے اسٹیل کے ہیں، نکال ہے"

حب ہی اس نے اس پر اپنی کہانیاں نکھیں اور فور سے سینئرز کی باتیں سننے لگی۔ جن میں اہم بات یہی تھی جو وہ بار بار دہرا رہے تھے۔

"سینئرز کا بہت احترام ہوتا ہے میڈیکل سائنس میں، آپ کو جھگڑا لہجہ زوریں کے مکر سمجھائیں گے ہم، ہماری مدد کے بغیر آپ پاس نہیں ہو سکتے، اس لیے ہم سے ملنا کر کیجیے گا۔"

یہاں تک تو بات بالکل ٹھیک تھی۔ میڈیکل میں سینئرز کے بغیر جو نیز واقعی سفر ہے لیکن اس سفر کو اپنی حیثیت بڑھانے کے لیے سینئرز کی کسی کیسی باتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں یہ چارے جو نیز زنی جانتے ہیں۔ ہال میں ہادی کے داخل ہوتے ہی جھٹکی لگاؤ اس پر لگی تھی۔ وہ وہاں سے ہی نکاری تھی۔

"بھائی میری قائل؟"

ہادی نے اس کے قریب ہوتے انہماں بننے کی اداکاری کی تھی۔

"کون ہی قائل؟"

ایک دم تو جھٹکے کا ان منہ بنا گئے۔

"وہی میرے اور پینل ڈاکٹر جنٹلس۔ وہاں گراؤ میں آپ نے لی تھی۔"

وہ ابھی یاد کر رہی تھی ہادی کی نگاہ قارئین ہاؤس پر لگی جس پر وہ کہانیاں لکھے کھڑی تھی ماس نے اپنی شرارت کومت میں سٹروول کرتے بہت سنجیدگی سے کہا تھا۔

"اودا چھاؤ قائل۔ وہ تو اس میں آگئی۔"

اس نے صغیر قارئین ہاؤس کی جانب پھٹکی تھیں۔

”اس میں۔ کیسے۔؟“ وہ بے یقین تھی۔

”آپ کو نہیں پتا۔ ہم بی بی ایس میں سب سے پہلے جیک ہی سکھایا جاتا ہے، مکمل ہے یا۔“
وہ ایک کرسی کھینچ کر اطمینان سے بیٹھ گیا۔

”دو آپ کے سر میں ہوتا ہے، ڈاکٹر جیک آنکھوں پر لگا دیتا ہے، ٹھیک ہو جاتا ہے، مادہ۔ خراب پیچہ ہوتا ہے، ڈرپ آپ کے ہاتھ پر لگتی ہے۔ جاکھ لکھ کر رہا ہوں، خون کا پریشر دل میں بڑھتا ہے اور بی بی آپ کی بازو سے چپک کیا جاتا ہے، کبھی دیکھا ہی بی بی آپ پر پٹر آپ کے دل پر لیٹا ہو۔ ہوتے ہیں ڈاکٹر پاگل۔“
سینئر ڈپٹی رو کے فرسٹ انیئر کو دیکھ رہی تھی اور فرسٹ انیئر جیسے سر ہاں میں ہلاتی رہی۔ ہادی جیسے اسٹائل سے بیٹھا تھا ویسے ہی اٹھا اور ٹھوس انداز میں جگت سے بولا۔

”اسی جاو کے ڈرپ لیتے آپ کی فائل اس میں آگئی ہے۔ اب ایسا ہے کہیاں ہٹا کر ڈاکٹر اٹھائیں اور فائل نکال لیں۔“

اس نے حیرانگی سے سب پر اٹھال تھی اور سینئر ڈپٹی کا تئیدی لگا تھا جس سے ڈاکٹر اٹھانے کا کہہ رہی تھی۔ ڈاکٹر اس اکیلی سے تو اٹھنے سے رہا تھا جس طرح لے بیٹھا تھا۔ فرسٹ انیئر کے دو ٹھن بچے اس کی مدد کو بڑھے تھے اور پھر کیا تھا ہڈاوائی سیکشن ہل فرسٹ انیئر کی رہی دہی بیچوں لے سمجھا تھا۔

بکس میں قارطن (مضبوط کرنے والا کمپینل) میں بھی ایک بڑا بڑا بڑا ڈیڑھ کی تھی جس کا سارا جسم کسی سیاہ لکڑی کی مانند اکڑا ہوا غوف تک لگتا تھا۔ ڈیوائی سیکشن ہل کا مطلب اب پوری طرح واضح ہوا تھا، یعنی مردوں پر تجربہ گاہ، یہ بھی شکر ہے میڈیکل میں پہلے دو سال مردوں پر ہی تجربے کرواتے ہیں، دھند آدمی آبادی تو ڈاکٹر بنانے بنانے میں ہی اٹھانے لگا دیتے یہ میڈیکل والے، اور تیسرے سال بھی چھانچے مرطبت کو کیا پتا اس پر کون سی پڑھائی پڑھی جا رہی ہے وہ اور گھر دانے تو دل میں خوش ہو رہے ہوتے ہیں، ہمیں ڈاکٹر ڈاکٹر چپک کرتے آیا ہے۔ یہ تو صرف ڈاکٹر اور اللہ جانتا ہے کہ وہ اپنے سینئر ڈاکٹر کے ساتھ اس پر کون سا نیا تجربہ کر سکتے آئے ہیں، خیر۔

ہادی فیل سوز میں ان کے قریب آیا۔

”کیا ہوا۔“ اس نے تاسفانہ چہرہ چہ کیا تھا۔

”فائل کی ڈیڑھ ہاڑی بن گئی۔ اوہ۔“ دوسرا مکانڈوں کی ٹیکہ اتار کر کچھ سوچنے کی اداکاری کرنے لگا تھا۔

”کوئی بات نہیں۔ کوئی بات نہیں۔ ہو سکتا ہے اس نے اپنے نیچے چھپالی ہیں بڑا اثر رتی ہو گیا ہے۔
غیر صورت لڑکیوں سے ہنگے لینے لگا ہے۔ چلو اس کے پیچہ کچھ لو۔“ ٹیکہ جاتے ہوئے یقین دہانی کر دئی۔
”نہیں۔“

جھٹ کے ساتھ باقی فرسٹ انٹیر بھی لڑ کر بیچے ہوئی تھی بشرم بھی تھی خوف بھی۔

”کوئی آئے ہیں ڈاکٹر بنے اور ڈاکٹر گئے ڈیڑھ ہاڑی سے۔ مائی ڈاکٹر فرسٹ انٹیر، یہ ڈیڑھ ہاڑی آپ کو کچھ نہیں
کہے گی، وہ ڈیڑھ ہے، جو کہیں گے آپ ہی کہیں گے اس چارے کو، بڑا ہی مصوم ہے، ہر ظم سہہ لیتا ہے۔“ ہاڑی
نے بولتے ہوئے پاکستان سے سر جیکل گھوڑ اور ماسک نکال کر پیتا اور قارئین بکس میں ہاتھ ڈال کر ڈیڑھ ہاڑی کا
چتر جیہا اکڑا قارئین کی بیکل سے کھینچا ہاتھ بکھا دھوا کر فرسٹ انٹیر کے بچوں سے مخاطب ہوا تھا۔

”چلو بھئی، ہاری ہاری آگے جو اس سے سلام کرو۔ پر سوں سے آپ کی ہاتھ ڈالائی سیکشن شروع ہو جانی
ہے، اس چارے کی جڑ چارے سے پہلے اپنے لفظاتے بحال کرو۔ بیوٹی یہ کسی کو اندر نہیں کہنے گا، بہت شریف
بندہ ہے۔ شاہاں آگے آؤ۔“

سب لڑکیاں ایک دوسرے کے بازو دھامے خشک قدم قدم بیچے ہوئی، لڑکے الگ ہوتی بنے کڑے تھے،
ہاڑی نے حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔

”ہائیں۔ کیا ہوا۔ چلو جھٹ آپ آگے آؤ۔ سلام کر دیکھ یہ فائل دیکھو بے گا۔“

”نہیں۔“ وہ حریف بیچے ہوگی۔

”بھئی کیا نہیں نہیں کار کمی ہے۔ فائل نہیں پا ہے۔“

وہ انکار میں سر ہلاتی رہی۔

”سوچ لو۔ بھر کالج داتے نکال دیں گے۔“

اس کی آنکھوں میں آنسو اس کی طرح تیر گئے تھے، کس شکل سے تو یہاں تک آئی تھی کمر میں صرف درختی

اس کی بے بسی کو محفوظ کرتا تھا اور یہاں بہت سے لڑکے لڑکیاں اس کی بے بسی پر جس طرح مسکرا رہے تھے سب اسے درخونی ہی لگے تھے سیکنڈائیر کی قارہ نے ہانک لگائی۔

”سیکنڈائیر۔ سارے قارطن بکسر کھول کر۔ لائنس آف کریں اور جلدی باہر نکل کر ڈورز لاکڈ کرنے ہیں۔ آج فرسٹ انیر کوڈ بیٹے ہالونڈ دیٹلم کریں گی۔“

پھر کیا تھا ڈائٹی سیکشن ہال میں چیخوں کا ایسا طوفان ابھرا جیسے جھت گر جائے۔ ایک دوسرے کو کھینچی فرسٹ انیر اندھا دھند باہر کی جانب بھاگی تھی۔ شاید ہی کسی نے پیچھے مڑ کر دیکھا ہو کہ ان کی جھوٹی سیکنڈائیر قہقہہ مار مار کر کیسا ہنوائے کر رہی ہے۔ دوسرے کرٹل جار کے قارطن میں حیرتی آنکھوں پر اچھا ناخن بجا کر کہا تھا۔

”یاد ہے اسٹائیر، بد دیکھتے ہی میرا تو سانس رک گیا تھا۔“

ہادی نے دروازے کے ساتھ رکھے اور بچل skeleton (دھانچہ) کی پھرے کی ہڈی پر چارے بچل کی بھری۔

”ہاں بھئی اب تو تمہیں ان سے شق ہو گیا ہے۔“

ان کا پہلا دن ویسا ہی گزرا تھا جیسا ہر روز سے ملنے آئے والے بچوں کا گزرتا ہے۔ سینئرز کا مد سے ریڈ ragging (مذاق) کرنا یہاں تک کہ بچے رو رہے ہوتے ہو جائیں مگر ان کے مذاق کی حد تمام حدود سے باہر تھی، جہاں فرسٹ انیر کا کوئی بچہ دکھائی دیتا تو جل میں جلی کی طرح حاضر ہو۔ سیکنڈائیر کے دو عین بچے انہیں گھیر لیتے۔ کسی کو اور آل انڈیا چپٹا کر کھاتے، کسی کا اسٹیجہ اسکوپ پکڑ کر معائنہ شروع کر دیتے ہلکا لڑکی کی قہقہہ کو ہلائے طاق رکھ کر انسانی اعضا کے ایسے پرشیدہ سوال کیے کہ چاروں کی آنکھوں میں پانی حیر گیا، ایک دوسرے سے نگاہ چمانے لگے۔ اوپر سے ان کی حالت پر سینئرز کے ٹھٹھے۔ دو صحت مند بچوں کو پکڑ کر ہلکا بنگ لے جانے لگے تھے۔

”چلو چلو ابیر جنسی ہے ہلڈو دیتا ہے۔“ خون ٹھٹھے کے نام سے ہی سب کی جان نکل گئی تھی۔ یک آواز بولے تھے۔

”خون ان میں۔“

”جی۔ جیٹا خون۔ جب شہر میں ایمر بنسی ہوتی ہے، سب سے پہلے میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہی لائن بنا کر جاتے ہیں خون دینے۔“ فرسٹ ایئر کی مریم خاصی دوپٹگی تھی جھٹ کے پیچھے جھپٹی آہنگی سے بولی۔

”یار کیا ہا تھا یہ میڈیکل تو ایک بلا کا نام ہے، خون بھی چرے کی۔“

”میرے تو باپ کی تو بھرا آئندہ کسی کو ایم بی بی ایس کا مشورہ دوں۔“
رودا بھی روہا نسی ہو گئی تھی۔

”مجھے تو قسم سے شوق ہی نہیں تھا، سب میرے اماں ابا کا کیا دھرا ہے۔“

یہ وہ برہہ تھی جس نے پہلی بار اعزسی ٹیسٹ میں ناکامی کے بعد رود کو گھر بھر کر بھوک ہڑتال کروادی تھی۔
ایما غیر ایمر کوئی اس کی نگر میں دلا ہوا اس کے دماغ کی دعا کرتا تھا اور اب کیا تھا مال عارفانہ پایا۔

”اماں کا کیا دھرا۔“ منہ لے بہت آہنگی سے جواب دیا تھا۔

”اماں یا اماں، جس کا بھی کیا دھرا ہے، جیٹا اب آگے، بگھٹنا تو ہم نے ہے۔ کاش پہلے پتا ہوتا۔“

جھٹ نے غور کی بار سوچا تھا اس کا فیصلہ درست بھی تھا یا غلط۔ شاید وہ واپسی کا ارادہ کر ہی لیتی اگر ہادی بگھڑے
میں اس کی فائل واپس دینے نہ آتا۔

”یہ آپ کی فائل۔ اب تو ایڈمن آفس بند ہو گیا ہے، کل فائل کے ساتھ سب میٹ کروا دیتا۔“

”اچھا مذاق ہے۔“ جھٹ کو طرہ تو بہت آیا تھا اور جی کیا کھڑی کھڑی ستارے لیکن اسے گھٹنوں میں سب
لوگ یہ ہادر کروا چکے تھے۔

”اگر چنکر سے بگڑ گئی، بگھڑا ایم بی بی ایس مشکل ہو گیا۔“

اور یہ بات غلط بھی نہیں ہے میڈیکل میں اتنا استاد نہیں پڑھاتے جتنا چنکر بگھڑا دیتے ہیں، اور اگلے دن
ہونے والی orientation (انتظامی تقریب) میں othh (حلف) کے بعد پرنسپل نے واضح الفاظ میں
بگھڑا دیا تھا۔

”ragging (مذاق) ہر یونیورسٹی سکول کالج میں چلتی ہے، ٹیچر ذمہ داریوں میں تب بھی لیکن میڈیکل ایسا

ادارہ ہے جہاں استاد خود چاہتے ہیں سینئرز بچوں کے ساتھ خوب مکمل مل جائیں تاکہ ان کا خوف ہر طرح کی جھجک چھوڑنے میں نکل جائے، ہمیں ایک ہفتے کے اندر چار بچے چاہیے ہوتے ہیں جو سب کے چچ میں اٹھ کر بڑا جھجک ہر طرح کا سوال کر سکیں۔ یہ میڈیکل ہے اس میں شرم و جھجک نہیں چلتی۔ gender (جنس) کو آپ ایک طرف رکھ دیں، آپ نے ساری ہڈی پڑھنی ہے اور سب کے ساتھ پڑھنی ہے۔ اس لیے سینئرز جو کچھ کہہ رہے ہیں مانگتے مست کریں۔ اڑاٹ کیلئے۔“

دل سے تو شاید کسی کے بھی کچھ نہ لگا ہو، سوائے کچھ تارے اور ایک دوسرے کو کھینچنے کے ٹپو کے مارنے کے مگر رہا نہیں خود ہی کہہ گئیں۔
 ”یہیں کیلئے۔“



شروع کے چھ دن تو خیر بہت ہی جھجک رہی تھی لیکن پھر وہ آہستہ آہستہ اس روحین کے ماویٰ ہونے لگی، سینئرز کا رویہ بہت بدھ رہا تھا اور چکا تھا اگر کوئی ہلکا سا لڑائی کر لیتے اس کے بعد ٹپک کر سمجھانے میں پھر سے دل سے مدد کرتے تھے۔ کئی نے تو اپنی بکس تک جو سینئر ڈکھائی تھیں بکس کا بھی عجیب قصہ تھا۔ جب پہلی بار کھول کے دیکھیں، آنکھیں کھلی رہ گئی تھیں۔ یہ تو پہلے ہی مسوم تھا ایم بی بی ایس کی بکس بہت موٹی اور مشکل ہوتی ہیں لیکن اندر سے کیسی ہوتی ہیں یہ تو کھول کے پتا چلا تھا پہلے ویک ایڈ کے بعد جب ردا آئی تھی بہت حیرت سے لے کر کہہ رہی تھی۔

”یار! میرے بیک کا پیرو مجھ سے زیادہ میری اماں نے دیا تھا، کبھی میرے چھوٹے بہن بھائی کوئی بک نہ کھول لیں۔“

سب کے مشترکہ فیصلے میں بروہ چپ رہے ناممکن۔

”اور میری ماویٰ کی اچانک نظر چلی گئی، یقین کرو! استغفار پڑھتے ہوئے وضو کیا۔ دو گھنٹہ صلوٰۃ تو پڑھا ڈالی اور مجھے کہہ رہی تھیں، بروہ صبح شام کھڑے ضرور پڑھ لیا کرو، ڈاکٹر تو تو یقین جانے گی پر اللہ جانے مسلمان رہے گی یہی یا نہیں، جیسی تیری کتابیں ہیں، استغفر اللہ۔“

”اور میرے باپا کی سنو۔“ مریم چبکی۔ ”انہوں نے جتنے فقرے کتاب اٹھائی کہ میری بیٹی ڈاکٹر بن رہی ہے اتنی کھیاہٹ سے واپس رکھ دی۔ پہلے ادھر ادھر چہرے دکھائے، دیکھ لاکھول والا تو وہ اب بالکل پڑھنے کمرے سے نکل گئے۔ اہاہاہ۔“

جنت کسی بات میں نہیں بولی تھی۔

”تمہیں کیا ہوا؟“ بریرہ نے اسے کبھی سے فہم کا دیا تھا۔

”کچھ نہیں۔“ ایک تو وہ پہلے ہی اپنے لباس، لب و لہجے سے غلط لگتی تھی اور اسے اپنے خاندان کی سوچ کیا بتاتی، بریرہ سے تو صرف کمر پڑھنے کو کہا تھا اور اس کے ہاتھ، کالے پڑھانے جائیں گے اگر دروغی دیکھ لیں؟ اس کا ڈر سامنے آ گیا تھا، دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت پر واقع کمر پر وہ تین ماہ بعد آئی تھی، دہائی تو اسے دیکھ دیکھ خوش ہو رہے تھے۔ سب نے غصہ آ کر بھگت کی سوائے دروغی کے۔ دن میں گھر والوں کے خوف سے کتابیں کھولی نہیں، اب بکسوں کے چار پڑھ بھی تو نہیں سکتا، پھر اصول جنت کے گھر والا ہو، اس سے رات کو کسی وقت پڑھنے ہوئے رکھی گئی اتالیقی کی کتاب دروغی کے ہاتھ لگی، وہ دیکھتے ہی ہلک کر گیا۔ قریب ہی تھا، اس کی کتاب پھاڑ کر دے، بے کی غم کرو، چار سرد خانہ چاکلے سے آگے اور اس کے ہاتھ سے کھینچی گئی۔

”یو کیا کر رہے ہو تم؟“

”فانی کی باتیں ہلاؤں گا نہیں تو اور کیا کروں گا۔ یہ کہہ سکتے ہی ہے یہ شرم میں۔“

امروڈ نے اس کے لالہ، بھوسکا چہرے کو ٹوٹ سے دیکھا تھا، کچھ رانت جھاکر بولے تھے۔

”جو مسئلہ ہم اپنے باپ بھائی کو بھی بتاتے گھبراتے ہیں وہ ڈاکٹر کو بتا دیتے ہیں۔ کیوں؟ کیونکہ ہمیں وہاں جا بے ہوتی ہے ڈاکٹر اگر یہ سب نہیں پڑھے گا تو علاج خاک کرے گا۔“

”پھر علاج کی باتیں پڑھیں۔ تصویروں سے کیا سمجھ رہی ہے۔“

”اور خوب۔“

امروڈ سے گھورتے ہوئے آگے بڑھے اور کتاب اس کے ہاتھ سے چھین لی۔

”کچھ چیزیں تصویروں اور ڈائجسٹرام سے سمجھ آتی ہیں۔ تم جاہل کو کیا پتا آٹھویں سے آگے پڑھا ہوتا تو پتا

امروز نے کتاب اسے بکرا دی اور راستے سے ہٹ گئے تھی۔ درختی نے اپنے گرد لیٹنی گرم شامل کو خیسے میں کھول کر زور سے لپیٹتے جھٹے کو سر سے پاؤں تک دیکھا تھا۔ اس نے نگاہ کا زاویہ بدلیا۔ وہ دو قدم آگے بڑھا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پہنکا رہا تھا۔

”تم ہم کو جاہل ثابت کرنا چاہتی تھیں۔ ہوگی قلی۔“

”میں خود کو انسان ثابت کرنا چاہتی تھی۔“

اس کے نرم لہجے پر وہ ناک شکنی چڑھا تاہر وہی درد اڑے کی جانب بڑھ گیا جھٹے کے کان اس کے غصیلے قدموں کی دھمک سنتے رہے۔

”اے اللہ، میرا نصیب اس شخص سے بڑا ہے تو اس کے دل کو بدل دے، اے کیوں وہم ہے میں اسے جاہل ثابت کرنا چاہتی ہوں۔“

یہ بھی درست تھا درختی تعلیم یافتہ نہیں تھا لیکن اگر یوں کا ہونا نہ ہونا کسی کا جاہل ہونا کب ثابت کر سکا ہے۔ جاہلیت کا تعلق تو دماغ کے غلط سے ہے اور یہ غلط بعض نکات بڑے بڑے تعلیم یافتہ خاندانوں میں بھی ظاہر ہو جاتا ہے۔ کبھی ضد میں کبھی خود کو برتر ثابت کرنے میں اور مردوں کو پیچھے رکھنے جیسی جاہلیت کبھی بھی مل سکتی ہے اس کے لیے پہاڑی درختی کا ہونا ضروری نہیں تھا۔



فرسٹ ایئر کی یہ تیسری پریزنٹیشن تھی جو ہر حسب ضرورت (بازو کا آسمانی نظام) پر پیش کرتی تھی، کلاس کے سی۔ آر۔ کلاس (class re-

presentative) نے منچر کو فوراً ہی اپنا نام پیش کیا تھا کہ یہ پریزنٹیشن وہ دے گا اسطرح کے ماسوں اسی کالج میں فقیر والوسی کے ایچ اوڈی (ہیل آف ڈپارٹمنٹ) تھے۔ باپ سرجن، ماں فزیویشن۔ پورا خاندان میڈیکل سے وابستہ تھا۔ اس کام بہترین ہونا چاہیے تھا، اسطرح نے اپنی پوری کارکردگی سے پریزنٹیشن ایک پوائنٹ بی میں تیار کی تھی۔ اگلے دن منچر کے کہنے ہی اس نے پورے ماحول سے اٹھ کر پوائنٹ بی دیوار میں لگی

ایل ای ڈی میں لگائی۔ اسکرین کے روشن ہوتے ہی سوال ایک ترتیب سے سلائیڈ کی صورت چلنے لگے۔ شارٹ اور لوگ سوال الگ الگ رنگ سے نمایاں تھے، مگر ہم زرد کے مختصر فکشن کو ڈائجرام کے ساتھ نمایاں کرنے پر لکھنے لگے اسے سرائتی لگا دے دیکھا۔

”گڈ ورک۔“ اطہر کے چہرے پر حیرت کا دھڑلایا تھا۔

”آپ نے بہت زبردست طریقے سے سسٹم پیش کیا ہے۔ کیا اسی طرح یاد بھی ہے؟“

”نہیں سر۔“

”ہم۔ نہیں۔“

انہوں نے اب کلاس سے مخاطب ہوتے کہا تھا۔ ”any question?“

چند اسٹوڈنٹس سوال کرنے اٹھے تھے۔ اطہر نے ان کے کچے سوال پر مختصر زرد کوڈ بکس سے ہائی لائٹ کرنے کے بعد دیا۔ جب ہی فکشن اپنی کردار کو اچھی طرح سے درست کرتی تھی، جیسے سے بھانکتی ڈین آئیں اسکرین پر تھیں۔

”سر اس سارے سسٹم میں سبز بکس زرد کون سی ہے؟“

لکھنے نے وضاحتی لگا دیا اطہر کا اٹھائی تھی۔ اطہر کی سنوؤں کے رتوں پر سارے جڑے تھے جیسے کہ زندگی ہو۔

”گئی اطہر جانتے ہیں آپ۔ کون سا ہے وہ زرد؟“

چاہیے تو اطہر کو یہ تھا زبان سے اقرار کرتا۔ ”نہیں۔“

جوابات نہیں چاہتے مان لینے میں آخر حرج کیا ہے جیسا کہ اس وقت ہم خود بخود کے اس میدان پر کھڑے ہوتے ہیں کہ ہم ہی پر فکٹ ہیں۔ ہم تصور کریں کہ کوئی ہمیں ان پر فکٹ ثابت کر سکتا ہے دیکھا یا بھی ہو سکتا ہے جو ہمیں مظلوم نہ ہو اور ایسا کرنے میں ہی ہم غلطی کر جاتے ہیں جس طرح اطہر نے کی۔ اس نے حلیم کرنے کے بجائے مختلف زرد بار بار ہائی لائٹ کئے، کبھی کبھی سے کدھے تک کے، کبھی پھیلی سے کبھی تک کے، لکھنے ہر بار ”نو۔“ میں سر ہلا دیتے۔ آخر لکھنے نے پوری کلاس سے پوچھا تھا۔

“any one know this?”

(کوئی اور جانتا ہے)

سب کے سب خاموش تھے۔ سرنے جھڑ سے ہی پوچھا تھا۔

“آپ جانتی ہیں؟”

“تو سر میں جانتا چاہتی ہوں۔”

نچرے حیران تھے جو چھڑ سٹیکس میں ابھی شامل نہیں کسی ساتھی کو پانچویں سے کیسے پتا؟

“لیکن آپ کو کیسے پتا میوزیکل نمبر ہمارے سٹیم میں شامل ہے؟”

یاد دلائے ابھی طرح تھا لیکن پھر بھی تھوڑا سا گڑبڑا گئی تھی۔ دو دونوں ہونٹوں کو اندر کی جانب کھینچے پھر سے

اٹھی تھی۔

“انکچ لی سر میں نے دو تین سال پہلے ایک میگزین میں آرٹیکل پڑھا تھا، اس میں میوزیکل نمبر کی لازم استعمال

ہوتی تھی۔ مجھے جانتا ہے یا کہ وہ ہمارے جسم میں ہوتی ہے یا جسٹ مذاق تھا۔”

“دو تین سال پہلے۔ ہم۔” نچرے نے سر اٹھتے ہوئے سر ہلایا۔ “یعنی جب آپ بچھے، تاکہ میں ہوں گی، گڈ

یو ہاٹ آپ کامیڈ ٹیکل سے اعتراف شکر کرتی ہے، آپ کی دلی آپ مستقبل کی قابل ڈاکٹر ہوں گی۔ بیٹھیں آپ سب

میں جانتا ہوں۔”

اطمینہ اندر تک آگے ہو گیا تھا۔ کچھ دیر پہلے ابھی بھلی اس کی قرعہ چھیں ہو رہی تھیں کہ یکدم ایک چنڈا دلڑی کی وجہ

سے کام میں قصور نکل آیا۔ وہ سین پر بیٹھتے ہوئے گردی سے جھڑ کو دیکھتے پڑ گیا۔

“یہ مراہیوں کی نہیں ڈاکٹر کی کلاس ہے۔ میوزیکل نمبر۔ ہونہ۔”

اس کی چٹا چٹا کر کی گئی بیڑا ہٹ نچرے بن چکے تھے۔ انہوں نے بجائے اس کیلئے کو مخاطب کرنے کے تمام

کلاس سے کہا تھا۔

“اگر آپ کے کام پر کوئی سوال اٹھتا ہے وہ آپ کی ناکامی نہیں بلکہ اس کام کی کامیابی ہے جس کی وجہ سے

آپ سمیت تمام کلاس کو سیکھنے کا موقع مل رہا ہے۔ اوکے۔”

تمام بچوں نے انہات میں سر ہلانے مگر اطہر نے غصہ کو کی بار کھٹکی لگا دے دیکھا تھا۔
 ”اس کی وجہ سے۔“

غصہ پوری توجہ سے اسکرین دیکھ رہی تھی جہاں سر کی دو اٹھکوں کے چمچے نروڈ کو ہائی لائٹ کرتے سمجھا رہے تھے کہ یہ کہاں سے کہاں تک جڑے ہوتے ہیں اور ان کی کس حرکت کی وجہ سے میڈیکل نروڈ کہا جاتا ہے، اطہر جب متوجہ ہوا جب سر نے بات ختم کرتے ہوئے بہت آرام سے کہہ دیا تھا۔
 ”یقیناً سب کو گینٹر ہو گیا ہے۔ اب کل اسی سسٹم پر اسٹیج ہوگی۔ خاص کر میڈیکل نروڈ پر خوب ریسرچ کر کے آئے گا۔“

یہ بڑے ختم ہوا، سر کے پیچھے سب ایک ایک کر کے باہر نکل گئے۔ اسٹیج، میڈیکل میں وہ ضروری ٹیسٹ ہیں جنہیں اگر گینٹر نہ کیا جائے تو ہر سال کا ریکارڈ خراب ہو جاتا ہے۔ اطہر ٹھسے کی وجہ سے توجہ ہی نہ دے پایا تھا اسٹیج کا سن کر مزید غور نہ کیا۔ وہ مختصر چل ہار ہا تھا اسے اپنے آگے نروڈ چاروں والی لڑکی چلتی دکھائی دی اس نے مزید لمبے قدم اٹھائے اور اس کے سامنے جا کھڑا ہوا۔

”کس کو تمہیں کے خاندان سے ہونم۔ ہاں؟“
 غصہ ابھی خاصی چمک گئی تھی۔ آنکھوں میں ہرانی تھی دھشت درانی۔
 ”میرے کام میں آج تک کسی نے قص نہیں لگایا، تمہاری جرات۔ برداشت نہیں ہو رہی تھی میری پریشانی۔“

”میں نے قص نہیں لگایا، میں صرف اپنی کینیوڈن دور کرنا چاہ رہی تھی۔“
 ”اوہ۔“ اس کے ہونٹ گولائی میں سکڑے۔ ”مستقبل میں طے بجائے ہیں۔ ہم نے جان کے کیا ہے ایسا۔“
 ڈی اسٹیج کی جانب بڑھتی برہہ کے قدم جان کی آواز پر تھے، دو دو ایس ان کی چاکب تھیں۔
 ”کیا بات ہے غصہ؟“

”کچھ نہیں۔“ غصہ وہاں سے ہٹا چاہ رہی تھی اطہر بھی ہونہ میں گردن جھک کر بڑبڑایا۔
 ”آ جاتے ہیں چڑ سے اٹھ کر میڈیکل کالج دیکھنے۔“

برہم فوراً انہی سمجھ گئی اور زور سے بولی تھی۔ ”زہاں سنہیال کے ہاتھ کرو مسٹر اطہر۔“
 اطہر نے میکانیکی انداز میں سر گھمایا تھا۔

”جسہیں رہا کیا کام خود نہیں آتا تھا اس میں جھگڑ کا کیا قصور ہے۔ اماں تمہاری ڈاکٹر، باپ تمہارے ڈاکٹر، بہن بھائی تمہارے میڈیکل کالجز میں بھرے پڑے ہیں تنہیال دوھیال سارا اسی سے منسلک۔ ایک چھوٹے سے فرد کا نہیں پتا۔ شیم اون ہو۔ تم سے ابھی تو یہ پینڈو ہے جس نے سر تک کو حیران کر دیا۔“
 ”پلو چلتے ہیں۔“ جھگڑ نے برہم کو آگے کی جانب پھل کر چاہا مگر وہ ڈٹی رہی۔

”کیوں اس کے باپ کا کالج ہے۔“
 ”تم کچھ میں مت آؤ۔“ اطہر نے اگھٹت الٹائی تھی۔

”کیوں نہ آؤں۔“ شیم جی۔ آر ہوں (girl representative) تم کلاس کی لڑکی کو ہر اساتذہ کو
 میں چپ رہوں۔“
 ان کی بدھتی آواز میں شیم پر بیٹھے سیکڑا اٹھ کر کے ہادی تک تھیں۔ ہادی اطہر کا بڑا بھائی تھا وہ اٹھ کر فوراً اوھر آیا تھا۔

”فرسٹ ائیر لائن پر اہلہ؟“
 ”لولو۔“ اطہر نے ایک تلخ لکڑیوں لڑکیوں پر ڈالی اور جانے لگا تھا مگر وہاں برہم موجود تھی جو بدھتیری پر اتنی آسانی سے اسے بخشنے والی نہیں تھی۔
 ”کیا لولو۔“ ٹاؤنا اپنے بھائی کو اپنی پر جھپٹیشن پر ایک چنڈو کے سوال کا جواب نہیں دے سکے، اب اس لیے اسے تڑپاں لگا رہے ہو۔“

ہادی نے ان تینوں کو باری باری دیکھا تھا۔ اطہر کی کچکھاتی ٹاپیں جھگڑ پر بھی تھیں جس کے کال گھبراہٹ سے مزید سرخ ہو رہے تھے جیسے ابھی لوٹک پڑے گا۔

”بہت بری بات اطہر۔ تم میڈیکل کے اسٹوڈنٹ ہو۔ یہ ایک لمبا ایجوکیشن ہے بلا جھگڑ کرو کچھ بھی نہیں آئے گا۔ چلو سوری کرو جھگڑے۔“

”نہیں، اس کی ضرورت نہیں۔“

فلجہ کے ماتھے پر وحشت کے مثل تھے اس نے برہہ کے ہاتھوں پر اپنا ماتھہ رکھتے سر ہینگی سے کہا تھا۔
”چلو بھی اب۔“

”رکو۔ ابھی دوسری کرتا ہے۔“

برہہ بڑبڑائی۔ پھر اپنے ہاتھ اور آل میں ڈالتے تھا مل مار قانہ سے کندھے اچکائے۔

”چلو اب جلدی کرو سوری، میں کیمین بھی جانتا ہے۔ بی بی اپنی کندیا میرا اب جس شوش نکلتا جا کر۔“
”سوری اور میں اس چنگی سے۔ مائی ڈ۔“

اس کے روپے پر ادھی نے سر ریش کی تھی۔

”اٹھو۔“

اٹھ کر جانے والا، وہاں کیمینوں پر حلیے اسکے دانت بھا کر برہہ کو کہہ گیا تھا۔

”وکیلوں کا قصہ میں اور قصہ بھی۔“

دوسرا جملہ جملہ سے کہا۔ وہ اندر تک لڑ گئی تھی

”دیکھا آپ نے اپنے بھائی کے روپے کو۔“

برہہ کے شکایتی انداز پر وہ قدرے غصے سے ہوئی۔

”بس کر جا کر برہہ۔“

اسے اپنی آواز کا بھتی ہوئی محسوس ہوئی وہ وہاں سے ہٹ جانا چاہتی تھی برہہ نے اسے روکا۔

”کہاں جا رہی ہو۔ کیمین چلتے ہیں۔“

”نہیں، میں ہوٹل جا رہی ہوں۔“

”رکیں پلیز۔ ایم سوری، میں سمجھا اس گا اسے۔ اور پلیس میں آپ کو کیمین لے چکا ہوں۔“

”نہیں شکریہ۔“ وہ اب پہنے سے بھی حیرتوں سے ہوٹل کی جانب بڑھ رہی تھی۔ برہہ اسے آواز میں

لگاتی اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

”جنت کرو۔ دک جاؤ۔“
گھر اس نے مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔



امروذ خان کو اس پر آج معمول سے زیادہ غصہ تھا، اس کے انتظار میں بہت دیر پہنچے میں ٹپکتے رہے، دو
تین بار اس کے کمرے میں جھانک آئے، رات کے دس بجے کو تھے مگر وہ ابھی تک گھر سے باہر تھا، اس کا بڑھتا
اہلی پین امروذ خان کو تپا کر رکھ دیا، آج صبح ہی وہ اسے سختی سے کہہ کر گیا تھا۔
”پہلے نام ہے، زمین پر آ جائے۔“

کئی کے سچ ڈالے جا رہے تھے امروذ خان کو کساد کے سلسلے میں ایک شہر جانا، اس کی غیر موجودگی میں
مزارعوں پر کوئی تو نظر رکھے مگر دروغی کی بنا سے۔ امروذ کے گھر سے ٹپکتے ہی وہ اپنے دوستوں کے ساتھ شکار پر
نکل گیا۔ رات ہونے کو آگئی ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ امروذ کئی دیر ٹپٹل ٹپٹل کر اس کا انتظار کرتا رہا، رات کو تو اس سے
ملاقات نہ ہو سکی مگر صبح ہوئے ہی اسے اسے انہوں لیا تو وہ بھی اکڑ کر پڑا۔
”ہم مرد کا بچہ ہے، شکار نہیں کرے گا تو دشمنوں کا مقابلہ کیسے کرے گا۔“
”کون سے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے تم نے۔“ امروذ خان نے ڈراخا۔ ”خوپہ اصل دشمن یہ ہے، یہ ہے،
اس کا مقابلہ کرو۔“

امروذ ایسے کھانے کو پڑا تھا، سیف خان گھر پر نہیں تھے مگر خانی اور منورا اور مہمان میں آ گئیں۔
”اسی لیے ہم کہتا تھا اس کی شادی کرو، ذمہ داری میں خود حمل آ جاتا ہے لیکن نہیں، تم نے جنت کو شہر بھیجا
ہے۔ اب بھگتو۔“

امروذ نے اگلے دانت جھا کر غصے سے اسے کھڑا۔
”جنت سے شادی کرنی ہے تو پہلے انسان کا بچہ بنے، اور نہ اس کا خیال دل سے نکال دے۔“
خانی اور منورا دونوں نے ہلکی سے امروذ کو دیکھا تھا جیسے کسی مرد کو دیکھ لیا ہو۔
”چتم کیا کہہ رہا ہے۔ امروذ خان۔ ان کا بچپن کا رشتہ ہے اور بچپن کا رشتہ مرنے دم تک چلتا ہے۔“

”اور کیا۔“ خانی بیگم نے حضور کی تائید کی۔ ”ہم کو نہیں اسے پڑھانا پڑھانا۔ ہلاؤ اسے اور شادی کروالیں۔“

ڈری ڈری زبردست بھی دروازے میں کھڑی ساس اور ماں کی سماجی لگ رہی تھی۔ امروز نے بھاری بھری نگاہیں عورتوں پر ڈالی اور ایک بار پھر اسے انحطاط سے صحیح کی تھی۔

”آئندہ میں آوارہ پھرتا نہ دیکھوں ورنہ۔“ اس نے غصے سے گردن جھٹکی۔ ”شکر کرو تمہارے نام ایک پڑوسی کبھی لڑکی ہے، ورنہ تم جاہل کو۔“

آخری لفظ اسے گالی سے بھی زیادہ کاٹ دار لگا۔ اس کا دل کیا ایک قبر کھودے اور غصے کو اس کی تمام کتابوں، ڈگریوں سمیت دفن کر دے، جس کی وجہ سے اب اس کو ہاتھ جاہل کی سٹول چکی تھی۔



کئی دن خاموشی سے سرگرم کئے تھے۔ ادنیٰ نے اطہر کو سمجھایا تھا یا نہیں جین اس کا رویا اب بالکل سروسا تھا، اس کے رویے پر فروغ کے کئی دن وہ انجلی خامی ڈسٹرب رہی تھی۔ وہ بڑا کا ہے، کچھ بھی غلط کر سکتا تھا۔ اسے دورہ کر رہا ہے پر غصہ آ رہا تھا۔

”اگر تم چپ کر جاؤ، انجلی ہمیں بات فہم ہو جاتی مگر تم نے اس کے بھائی کو ضرور بتا دیا۔“

”کیوں چپ کر جاتے، کوئی گتے ہیں ہم۔“ ”یہ وہ اس سے شک نہیں تھی۔“ اور تم خواہ مخواہ اس سے ڈر کر آئیں، تاکوں چنے نہ چھوڑتی اس کو بھر کیس۔ دیں رہیں کرتا پاؤں پکڑتا۔“

”تم یہ سب کہہ سکتی ہو، یہ وہ۔“ ”وہ ابھی کرے میں آئی تھی۔“ آج ہی موضوع کھٹکے بھگے گی۔ ”تمہاری اور جنت کی فیملی میں بہت فرق ہے۔“

”کیا فرق ہے، میری فیملی نے مجھے آوارہ چھوڑ رکھا ہے، جس مرضی سے سر پھونڈیں۔ میں نے جائز بات کی ہے۔“

”تم اپنے نظریے سے جائز سمجھ رہی ہو، یہ جین میری فیملی کے نظریے کچھ الگ ہیں۔“

جنت کھٹکے کھٹکے کر کے ان کے گروہازو لپٹ کر بیٹھ گئی۔ لہجے میں بہت صحن اتر آئی تھی۔ ”ہمارے ہاں

عزت پر دنا تھیں نہیں سنی جا تھیں، صرف ایک زبان میں بولا اور سنا جاتا ہے۔ بدعوق کی زبان میں لڑکیوں کے معاملے میں بحث ٹھکرا ہا کھل نہیں چلتی۔ تم کیوں نہیں سمجھتی، اور ویسے بھی وہ لڑکا ہے، برہ۔“

”تو ہم لڑکیاں ہیں، وہ سمجھ جائے۔“ برہ اسے جتا کر بولی لیکن جھست کی پریشانی دور نہیں ہوئی تھی جب ہی اس نے اسے پیار سے سمجھایا تھا۔

”لڑکوں کو ان کی حد میں رکھو تو یہ ٹھیک رہتے ہیں، ورنہ انہیں دیر نہیں لگتی اپنی اذیت بھولنے میں۔ اور انہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کسی بدعوق سے۔ وہ کسی سے کچھ کہے تو کسی ماں کی ہڈیاں توڑ کر اس کے ہاتھ میں پکڑا دوں گی یا ہڈیوں کی مالا بنا کر اس کے گلے میں نڈال دی پھر کہنا۔“

جس اعداد میں اس نے کہا تھا، کتاب پر جھگی سرخ اور دنا خست ہوئی دوہری ہو گئیں۔

”ویسے تمہارے ارادوں سے لگتا ہے پارتم آرٹھوپیڈک ہی ہوگی۔“ ان دونوں کے قہقہوں میں سفید جوتی جی سبکی نئی تھی بولی تو جھست کا سوا کچھ دہر کو کسی مگر بدل گیا تھا اور بھر سب معمول کی طرح چلا رہا۔ چھوٹی موٹی بہ حرمیاں اسٹوڈنٹس میں ہوتی رہتی تھیں، چہ عالی میں کم ہو کر سب بھول جاتے تھے۔ اطہر بھی جھینا بھول چکا تھا، اس کا سر رو پیا ہوا آہستہ پھٹا اور دنا بھن پڑا لے گا، جھست بھی بھول گئی۔



دن بھا دوں کی بوندوں کی مانند برس رہے تھے، جیسے جیسے پچھلے سال کے احسانات قریب آنے لگے، بچے اپنا انخوا میں چڑا کام سمیٹ رہے تھے، ان کی osphy (ڈیڈ ہاؤس یا اس کے اڈال پر جسم کے مختلف ٹشوز یا سسٹم کی پن لگا کر نکال دئی کرنا) کی کچھ تیاری رہتی تھی جس کے لیے ان کے لمبے زونے انہیں بار بار ڈائی سیشن (ڈیڈ ہاؤس پر پیکٹیکل) کرنے کا کہا تھا۔ سی۔ آر نے بار بار بچوں کے پیٹ مار کئے تھے۔ ہر پی ڈی ایچ (ڈائی سیشن ہل) جاتا اپنا کام کرا تا، جھست اپنے پیچ کے ساتھ نہیں جا سکی تھی۔ اس کے ہوسٹل کے کچھ ایڈورس جے تھے اسی سلسلے میں اسے جک جانا تھا، جک کی برانچ وہاں کالج میں ہی تھی لیکن پھر بھی اسے کچھ ناگم لگ گیا۔

دوا لگے دن پیچ پی کے ساتھ چلی گئی تھی۔ اور آل، سر جیکل گوز اور اسٹک پہنچے تیرہ بجے ڈائی سیشن بھل کے گرد کھڑے تھے ان کے سامنے ہی ایب انٹینڈنٹ نے فارٹن بکس کھولا۔ پورا ڈی ایچ فارٹن کی بو سے مہک گیا۔

شروع شروع میں یہی بہانہ اس قدر بنا کواگتی ہے ذی الحجہ سے باہر نکلتے ہی بچے ہنسنا شروع کر دیتے ہیں۔ ہاتھ دھو کر کھانے پینے کے لیے جاتے ہیں۔ یہی سلسلہ سالوں سے جاری رہا ہے۔ دس دس کے مریضوں پر فضا ختم ہو کر آگئے ہوں مگر وقت کے ساتھ وہ بہانہ معمول کی ہنس میں بدل گئی۔ برہ نے تو کئی بار سختی سے کہا بھی تھا۔

”یارگتہ ہے ڈیڑے ہاڑی نہالی ہے، اب پوچھیں آتی۔“

اس کے پیچھے کھڑے سرزادہ نے خاتون پر بھری جھپٹ اس کے کندھے پر لگائی۔

”میرے بچو! اب تمہیں ساری زندگی کوئی بوجھ نہیں آنے لگی، تامل پرچی ماسٹی بوتھارے اعداد و شمار بھی ہے۔“

اس وقت بھی مسئلہ یہ ہے کہ نہیں بلکہ رٹن کی جھپٹا ہٹ سے ہوا تھا۔ ہوا کچھ ہوں تھا ہوا کی کے ٹھیک ہر کہتے
 ہی سیکڑا خیر کے کچھ اسٹوڈنٹس ڈی ایچ میں داخل ہوئے تھے، انہیں ہوا کی کچھ حصہ چاہیے تھا۔ فارٹن سے ہنگی
 ہوا کی کچھ کر ہادی نے ملائی ۱۵۰ سے لپ اسٹینڈنٹ کو دیکھا تھا۔

”سرا آپ کو چاہی ہے، کوئی بچھن سے ایٹ لسٹ پانچ، چھ گھنٹے پہلے ہاؤس بھیل پر شفٹ ہونا کہ فارمن اڑ جائے ساقی جیجا ہٹ مل پر کیسے کام کریں گے۔“

لیب اینڈنٹ پہلے ہی اسکا پورا حوالہ دے گا اور سامان کا نو بھر صاف کر کے اس کی جگہ پر پہنچا دے گا۔ یہ سے بھی کسی
بچہ سے ڈانٹ بھی اسکا ادوی ہے، آج اسنو ڈنٹ بھی نقص کا لئے گئے، چ کر رہا تھا۔

”یہ کون سا لاکر رکھے تھے، تمہاری بات تو بیکار لگائے آگئے۔“ جی ہاں کرنی ہے، ہوش۔“

دو کہہ کر سیکڑا بھری کا روکی بات سننے لگا جو ڈالنی کفر (آکر لے گا اور) مانگ رہی تھی اسے ہاڑی کا سرکات کر رہی (و ما رخ) کے فروز بخشنے تھے۔ ہادی، اعلیٰ کو دی آواز میں کہنے لگا۔

”اے غیر ذمہ دار مت، خواہ تم ہی آ رہی شیدول اینڈنٹ کو کیوں نہیں دیکھو۔“

اس سے پہلے الطہر مغنی میں یزید اٹا دیا ایسا ہی تھا انہی نقلی کو تسلیم کرنے کے بجائے لفظ کرنے والا۔
ڈاکٹر زاہد جالب میں داخل ہوئے اور یکے بعد دیگر کو دہاں دیکھ کر مسکرا دیئے۔

”ایسا ہے سیکڑا خیر، ایک امیر جنسی میں مجھے ہا چل پہنچتا ہے، آپ فرسٹ انجیر کو ڈائی سیکن کرنا دیں۔“ انہوں نے ہاڑی کی پٹری کی جانب اشارہ کیا۔ ”پ lower lamb کرنا ہے۔“

سیاحی مال پرین نکال کر ٹیل کی ڈیش میں رکھتی قارہ جلدی سے بولی تھی۔

”سر ہادی کروادیں گے، مجھے یہ لب میں لے جانا ہے، ہر انھیں میرا نٹ کر رہے ہیں۔“

قارہ کہہ کر فوراً سے نکلی تھی۔ ہادی سر خلیم تم کرتا آگے بڑھا اور ڈائی سیٹھن کیت سے ایک کنڑاٹھا کر چٹلی کی جانب ہوا۔ سب بچے اس کے گرد گھیرے کی صورت بن کر قریب ہوئے تھے۔

”ڈورا قاسطو رکھو، مجھے ہاڈی پر کرانا ہے۔“

”ہاں، بھئی ڈورا احتیاط سے اور مجھے بھی دیکھنے دو ٹیک بھی کر رہے ہو۔“

ڈاکٹر زادہ وہاں رکھی ایک کرسی پر ٹانگ پر ٹانگ بجائے بیٹھ گئے۔ کیونکہ انھیں ہاسٹل سے پھر فون آچکا تھا اب ان کی وہاں ضرورت نہیں۔ ایمر جنسی کنٹرول ہو چکی ہے۔ وہ ایک ایک بچے کو تنقیدی نگاہ سے دیکھ رہے تھے۔ ہادی دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی اور انگوٹھے میں کنڑ بکڑے بانٹیں ہاتھ کے انگوٹھے سے جلد دہا تا کسی ماہر قصاب کی طرح ہاڈی کی چٹلی پر کٹ لگا رہا تھا۔ اس میں اور قصاب میں صرف اتنا فرق تھا لایچکی کمال نرم اور گرم ہوتی ہے جو قصویٰ ہی خشک سے اتر جاتی ہے جب کہ سال بھر سے رکھی ڈیڈ ہاڈی کی جلد اکڑ کر کسی درخت کی سخت چھال جیسی ہو چکی ہوتی ہے، ایسا احتیاط سے اتارنے میں دائیں ہاتھ کی انگلی اور بانٹیں کے انگوٹھے کا اتنا زور لگتا ہے بعد میں ہاتھ تھکی در سہلانے چتے ہیں یہ ڈاکٹر ڈی ہاتھتے ہیں۔ اس نے کچھ حصے پر کٹ لگا کر سیاہ جلد اتاری، دائرہ سے زردی مالک جسم جھلکنے لگا، ڈیڈ ہاڈی کا کمر اور ٹھیک اس لیے ہو چکا تھا خون کے خلیات ختم ہو کر خالی ہو چکے تھے، ان خالی شدہ خلیات میں ہی وہ مختلف دروازیوں کا تار ہا۔

”ہادی اب آپ ٹھیک، ہادی ہادی ان سے کہنا نہیں۔“

ڈاکٹر زادہ کی حکم پر اس نے اثبات میں سر خم کیا۔ اطہر کو آگے آنے کا اشارہ کرتے کنڑ وہاں رکھا، دونوں ہاتھوں کی انگلیاں آپس میں چبھنا کر بائیں ہاتھ سے ہاتھ اور پر کوٹھا تا پیچھے ہوتا گیا۔ اس کی جگہ اطہر نے لی۔ حریہ حصہ چاک کرتا وہ بھی نرور اور آرٹریج تار ہا تھا، سر نے اب اسے جانے کا اشارہ کیا تا کہ دوسرا آ سکے۔ وہ کنڑ وہاں رکھ کر پیچھے ہونے کے لیے مڑا، ٹھیک اس کے بہت قریب کنڑی تھی اس کے ہاتھوں کی چھپا ہٹ پر وہ کراہیت آمیز پیچھے ہوئی۔

”ہاتھ اوپر کریں، آپ کے ہاتھوں سے قارطن کچ رہا ہے۔“ ڈاکٹر زاہد کو یک لخت طعنے آگیا تھا وہ زور سے ہنسنے لگا۔

”اٹھو۔ آپ نے ہادی کو قاتل نہیں کیا۔ وہ کیسے پیچھے ہٹے تھے۔“ وہ کھسینا ہو گیا۔ ”ہاتھ جوڑیں، اور اوپر کو اٹھائیں۔“

اس نے انگلیاں آپس میں پھنسا لیں ہاتھ اوپر کٹاٹھے۔

”ہاتھ اٹھائیں۔۔۔ جا کر کھڑے رہیں۔“

وہ پیچھے ہٹا گیا۔

”آپ ڈاکٹر بن رہے ہیں یا گدھے۔ چاہے کتنی انگلیاں ہوتی ہے ڈیڑھ ہاڑی، اور اسی ہے احتیاطی سے کٹا انگلیاں مکمل کر سکتا ہے۔ ہر سال ختم ہونے کو ہو گیا ابھی تک ڈائی سیکن کر رہی تھیں آئی۔ آئیں ہیں ڈاکٹر بنے۔ تم سے زیادہ احتیاط مرنے کا بچے تھاب کر لیتا ہے۔“

سر زاہد کی مسلسل ڈانٹ اور بچوں کی کسر پسر ہاتھ کادل کی ڈیڑھ ہاڑی کی جگہ جگہ کولتا کر اس کی چڑچھاؤں دے۔ اس وقت اس نے خود کو بہت مشکل سے قابو کیا تھا۔ جگہ کو بھی اندازہ نہیں تھا اچانک سے ادا ہوا جملہ کوئی مشکل بھی پیدا کر سکتا ہے۔ کلاس کے ختم ہونے پر اس نے دلے صرف اتنا کہا تھا۔

”تم نے جان کر اپنا جاس کیا تھا تاکہ میرے ساتھ چلا کے سکول میں تمہیں اس کا مطلب بتاؤں گا۔ اٹھ بیٹھ گیا ہے۔“

دھمکی سے غصہ کی پھری جان مار رہی تھی۔



اس واقعے کے بعد ہاتھ کو کچلی بات بھی بے طرح نکلتے لگی تھی۔ اسے سوچ نہیں مل رہا تھا کس طرح بدلہ لے۔ بچہ ز میں گفتی کے دن تھے اور ہوٹلوں میں موت کا سامنا تھا۔ حالانکہ تعداد معمول سے زیادہ تھی۔ عموماً میڈیکل کالج میں اسی شہر کے بچے آٹھویں نہ ہونے کے برابر ہی ہوتے ہیں اور بچہ ز میں وہ بھی ہو سکتے آ جاتے ہیں کیونکہ جہاں تو ایک بچہ بھی یاد نہیں کیا جاسکتا کہ وہیں میں بیٹھ کر تجاوی ہوتی ہے اور وہ دونوں مسلسل جاگ کر

بھی بغیر چیٹنگ کے پورا بچہ کتابہ مد مشکل ہے، تمام بچے اپنی پوری تیاری کے ساتھ اپنے بخورم پہنچ چکے تھے اور ایک دوسرے کو بریف کر رہے تھے، انہیں حرج نہ بھانے کے لیے سیکڑا ٹیئر نے بھی چکر لگائے۔

”چیٹنگ کا کیا سوچا ہے؟“

سیکڑا ٹیئر کی قارہ کی بات سن کر سب ایک دوسرے کا منہ جھٹکے گئے تو ہادی بول پڑا۔

”اتنا ٹیک یہاں کوئی نہیں کر چیٹنگ نہ ہو۔“

ساری سیکڑا ٹیئر نے ٹٹلی میں سر دھتے اس کی تائید کی۔

”ناممکن۔“ ہادی بتانے لگا۔

”آپ سب ایک کلاس ہو، پوری کوشش کرنی ہے سارے ساتھی پاس ہو جائیں لیکن منہ سے بول کر نہیں خاموشی سے، کوڑ زمین، کوڑا گر بوٹیاں شوٹیاں ہیں تو یہاں ہی نکال دو، پکڑے گئے، میڈیکل سے باہر ہو جاؤ گے وہ بھی بے عزتی کے ساتھ۔ بس مدد مگر خاموشی۔“

کچھ ہی منٹوں کے خاموشی کوڑاڑے پائے گئے، اطہر نے سوالوں کا کوڑا جوتا بھانٹا دیا تھا، یعنی جس نمبر کا سوال نہیں آرہا وہ اتنی بار اپنا پاؤں زمین سے گھرائے گا۔ میڈیکل کا بچہ تقریباً سب مرضی ہوتا ہے، ہمارا آپشن سے ایک درست، جواب کا کوڑا برہانے لگایا ہے جواب آتا ہو۔ دو درست آپشن پر کھانے کا، یعنی آپشن اے تو ایک بار کھانا ہے، بی تو دو بار، اسی طرح ڈی تک۔

ہال میں کچھ ہی بچے شروع ہوئے۔ کچھ دیر خاموشی سے بچہ ہوتا رہا مگر وہاں کے ایک کونے سے کبھی کبھار اُبھرتی، کبھی جوتے گھرائے U.H.S سے آئے انگریز کچھ دیر کھانا کھاتے رہے پھر اپنا ماضی بھلا کر گرے۔

”آج سارے استاد اور مرگی کے مریض بچہ دے رہے ہیں، جو سانس نہیں آ رہا، ایڑیاں رگڑی جا رہی ہیں۔ خاموشی ہو کر کام کرو ورنہ جمن لوں گا سب سے۔“

پھر تو جس پچارے کو کچھ کچھ کھانسی آرہی تھی اس نے سانس بھی روک لیا، اطہر، ٹیئر سے ایک قطار کے قافلے پر تھا، اسے اندازہ ہوا تھا وہ خاموشی سے بچہ کر رہی ہے جیسے درست بھی ہو، چوتھے سوال پر بری طرح اٹکا

تو اس دوڑ سے نکل کر ایک جانب کھڑی ہو جائے اور تماشہ دیکھے۔ یا پھر بھاگے اور تیز بھاگے۔ بن کسی کو دیکھے، بنا کسی کو روکے۔ اسے بھاگنا تھا مگر کسی کو گرانے نہ۔ روکے بنا، پہلا سال مشکل تھا پھر دل پر لینا چھوڑا تو سب آسان لگنے لگا تھا۔

پہلے دوسالوں کی کھالیں کالج میں ہوتی رہیں۔ اطہر نے رنج کرنے کی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔ تیسرا کلید کل سال شروع ہوتے ہی پہلے پر پلے کے بعد اسٹیج اسکوپ اور آل میں ڈالے قائل اٹھا کر باہر چلے جاتے۔ وہاں جا کر چھوڑ کے سینئرز کے ساتھ پونٹ بن گئے تھے۔ اطہر اور اس کا پونٹ الگ الگ تھا۔ کم کم سامنا ہوتا۔ پھر اکثر ٹانگ کا بھی فرق ہو جاتا۔ ٹیڈ کا پونٹ ہڈی کے ساتھ تھا۔ اس سے ملاقات ہوتی رہتی تھی، نکل صورت میں تو بھائی جیسا لہا چڑا خوبصورت سا تھا، کچھ تیسرے چوتھے سال میں جاتے ہی ڈاکٹر کی اتنی گردنک ہو جاتی ہے عام سی نکل صورت کے بھی دلکش لگنے لگتے ہیں، لیکن وہ اطہر کے برخلاف اخلاق کا بھی دلکش تھا۔

ٹیڈ اس کے اخلاق سے متاثر تھی جب کہ وہ پوری ٹیڈ سے متاثر ہو چکا تھا، باقی لڑکیوں سے مختلف اپنی ذات میں قہر مگر ذہین ٹیڈ، اسے شروع میں ہی بہت اچھی لگی تھی۔ فری وقت میں ایک دوسرے سے ٹاپک ڈسکس کرتے ہوئے وہ اس کی جلی کے پارے میں بہت کچھ جان گیا تھا۔ یقیناً جانتے میں اسے دلچسپی بھی محسوس ہوتی تھی، اسے اس کے شوق اور مت پر حیرت تھی کس علاقے کی ہو کر تھی دلچسپی سے پڑھ رہی ہے، پھر سب کے سچ چلتے ہوئے مکمل احاطہ بھی۔

درختی کا مزاج بدلانا ممکنات میں سے تھا لیکن اس روز اس پر کڑی نگاہ رکھنا تھا، اس روز کی سختی، ڈانٹ ڈپٹ پر سیف خان نے انہیں ہی سمجھایا تھا۔

”تم غرمت کرو، شادی کے بعد خود ہی ٹھیک ہو جائے گا۔“

”مامی آپ کو لگتا ہے، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔“

”کیوں تمہیں نہیں لگتا؟ مسداری بڑے بڑے کو ٹھیک کر دیتی ہے۔“

”پتا نہیں دلائی، مجھے نہیں لگتا۔ غلط اور غلطی میں بہت فرق ہے، مجھے تو اس فیصلے پر یقین ہوتا ہے۔“

”کس بات کا فرق امر دز خان۔“ سیف خان غصے سے اپنا ساقا ہچکچاتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”اگر جنت چار لفظ پڑھ گئی ہے، مگر کے بچے میں تمہیں قصص دکھائی دیتے گئے۔ ہم پہاڑی لوگوں کے فیصلے اٹل ہوتے ہیں، جتھے ہوئے۔ چار کتابیں ہماری روایات نہیں بدکتیں۔“

سیف خان غصے سے گردن ہلک کر جاتے جاتے کہہ گئے۔ ”اس کی ڈاکٹری پوری ہونے والی ہے۔ شادی کے لیے گھر میں جو مرتبیں کر دانی ہیں شروع کر دو تم۔“



وقت کی پچھلن ان لمحوں پتا نہیں چلتی جب سب ہمارے بہت باہر مرکز کا جب پتا چلتا ہے جب سارا ہمارا آنے لگے، اور مرکز میں تکلیف تو دیتی ہی ہیں۔ چار سال تجزی سے گزر گئے۔ یہ ان دنوں کی بات جب جنت چار پانچویں سال میں تھی اور ہادی کا چھٹا ہاؤس جانب کا سال شروع ہو چکا تھا۔ ان کے بچے تبدیل ہوئے تھے۔ لست میں جنت اور اطہر کا نام ایک پونٹ میں تھا اور اس کا پورا دل تھا۔ اپنا پونٹ کسی طرح تبدیل کر والے۔ بے شک اب ان کے درمیان کبھی کوئی ناغوشی کو رہا بات نہیں ہوئی تھی لیکن جنت کی غیر معمولی قابلیت نے اسے تمام میچرز اور اسٹوڈنٹس میں خوب نمایاں کر دیا تھا جو اطہر کے لیے امدادی خط کا سبب بن رہی تھی۔ وہ اس کا اظہار لفظوں کے بجائے اعداد سے کرتا، اس کی جگہ آہٹ لگتی ہیں اور خاندانی پروفیشن کا رعب جنت کے سامنے زیادہ سر اٹھتا تھا۔

پونٹ تبدیل کرانے کے لیے اگر وہ اچھا اداوی سے بات کر لے مسئلہ اب بھی حل ہو جاتا تھا لیکن انہیں سمجھانے کے لیے کئی طرح کی دھماکی دینی پڑیں، ہاؤس جانب کے اسٹوڈنٹس کی ایسے معاملات میں بہت چلتی ہے اس کی ایک اہم وجہ ایمر جنسی میں ہائیکس ہائیکس کھینے کی ڈیوٹی ہے مجبورہ اپنے سینکڑا ڈاکٹرز کی ہکدہ دیتے ہیں اور ہادی سے کہتے اسے زیادہ ہچکچاہٹ نہیں ہوتی تھی۔

وہ ہادی ہی تھا جو بچہ کے کئی بار کام آچکا تھا۔ ایک بار تو قریشی طاہرہ ہو تھا۔ خاصی پرانی بات تھی جب جنت کا سیکٹر ایئر فٹم ہو رہا تھا اسے رینج ہکی ہڈی کے آخری سرے کو پڑھنا تھا، اسی سلسلے میں دو لیپ انٹینڈنٹ کے پاس

گئی۔ اسے ہاڈی کی ہڈی چاہیے تھی۔ لب میں اس وقت اس کے تھن ماڈل اور ایک اور بیکسل رکھی تھی۔ اس کے ادیکسل مانگنے پر انٹرنٹ نے کہا بھی تھا۔

”آپ یون کا ماڈل لے جائیں۔ اور بیکسل یون کہیں آگے بچھے نہ ہو جائے۔“

”اتنی لاپرواہ نہیں ہوں میں سر۔ دو تھن ون میں داہیں کردوں گی، مجھے ضروری ڈائیکگرام دینی ہے۔“
تھوڑی پس و پیش کے بعد انٹرنٹ نے اس کا نام رجسٹر کر لیا۔ تھوڑی دیر بعد اسی دن اچانک ہی دو تھن ون کی پیمانی اتار دی گئی۔ دو ایک اینڈ کی ٹل گئیں۔ سب بچوں نے مگر جانے کا پرگرام بنا لیا تھا۔ جلد ہی گمراہ گئی تھی۔ اس کے گمراہ لے پر عید کا سا سماں ہوتا تھا۔ وہی گمراہ لے جو اس کے شیر جا کر پڑنے پر پریشان تھے۔ اب سارے لٹے ملانے والوں کو فخر سے بتاتے تھے۔

”مزے (ارے) جلد ڈاکٹر بن رہی ہے۔“

یہاں تک کر گئی اڑوں پڑوس کی لٹے بھی آجاتی تھیں اور ہر دوسری اسے اپنی بیماری ایسے تفصیل سے بتا کر علاج پر چمتی جیسے وہ کئی کئی اسپتال بن چکی ہے۔ اور خانی بیگم فخر سے سرافحہ لیتیں، جیسے وہ ابھی دوا لکھ دے گی اور سامنے والی کو آرام آجائے گا۔ اب ان سادہ لوگوں کو کیسے سمجھائے ابھی تو صرف جسم کا نظام پڑھ رہی ہے۔ علاج تو آخری سال میں پڑھا یا جاتا ہے۔ وہ ہالے کے لیے سکرا کر قیاس لگاتی۔ اسی قیاس کو سننے کے لیے کوئی نہ کوئی آئی رہتی تھی۔

اس شام بھی دوا اپنی چیزیں لیے درجے کے ایک کونے میں بیٹھ گئی۔ اس کے سامنے کچھ بک اور ایک کتاب کھلی تھی۔ ہاتھ میں یون پکڑے اس پر دین (رگوں) کی ڈائیکگرام کھڑی تھی۔ جب پہلی بار دوا نے اس کے پاس انسانی ہڈی دیکھی۔ وہ ہنسے تھے، امر دلال کی منی میں کراہیہ تھی لیکن کور بختے تو اچھل کر اس کے بیک سے پیچھے ہوئی۔

”یہ تم گمراہوں نے آئی ہو۔ تمہیں ڈاکٹر نہیں لکھا مروے کی ہڈی سے۔“

وہ زور سے ہنسی تھی۔

”میں ڈاکٹر کی کیا بات، جیسا کہ ہمارے جسم میں ہے، وہی تو ہے یہ اپنے جسم سے ڈاکٹر ہیں کوئی۔“

”مردہ اور زندہ میں فرق ہوتا ہے۔“ زربخت نے اس کا جیک بائگل ویسے اٹھا کر کمرے سے باہر رکھا تھا جیسے وہ اس کا اور آل اٹھا کر نکلے کے پاس دھونے کے لیے رکھتی تھی۔ اسے جب سے چا چلا تھا یہ بائکن کر فٹس مردوں کی کاٹ پیٹ کرتی ہے اس نے لمبی سی چھڑی سے اور آل اٹھایا۔ حسلے میں ڈال کر نکال دالے پانی میں بھگو یا تھا اور یوں کو تو دیکھتے ہی اچھی خاصی جھرمجری آ جاتی تھی۔

”جنت دکان وہاں غریب کو خواب ملے گا۔“

”جب اسے سینکڑوں بچے پڑھ کر لاکھوں کا علاج کریں گے، ساری انسانیت کو خواب ملے گا۔ اور خدا کے واسطے خواب کے پکر میں تم اسے دکان دینا، کالج دالے مجھے نکال باہر کریں گے، بہت مشکل سے ملتی ہیں یہ۔“

دکان تو ایک طرف زربخت قریب سے نہ گزرے، جب بھی وہ اسے بلانے آئی، ہڈی ہاتھ میں دیکھ کر دور سے ہی پکاری تھی۔

”جنت اور یا خان کی بہا آئی ہے تم سے ملے، مردے (اس) کے کمرے میں بیٹھی ہے مل لو۔ بلا ہی ہے۔“

اسے چا تھا وہ چار یوں کی لمبی چوڑی لہرست لائی ہوئی سا گردنگی تو بارض۔ یوں کتاب پر رکھ کر وہ خانی حکم کے کمرے میں گئی تھی۔ اس نئے اندازے کے مطابق دریا خان کی بہا سے دیکھتے ہی شروع ہوگی، اس کی بات تو اس نے ہالے سنی تھی بھی یا نہیں اس کی نگاہ کھڑکی سے دکھائی دیتے دروغی پر گئی جو یوں اٹھا کر ساتھ کر رہا تھا، وہ فوراً باہر کی جانب چلا۔

جس چیز کا دروغی کو پتا چل جاتا کہ فٹس کے بہت کام کی ہے، یا بہت مشکل سے ملتی ہے اسے توڑ پھوڑ کر بہت سکون ملتا تھا، وہ ابھی تک بھولی نہیں تھی، جب اس نے اپنی مسئلہ چل (دو پنسل جو صرف سڈ نیگل میں ہڈیوں پر ڈا انگرام بنانے میں استعمال ہوتی ہے) کا تالا۔

”تالا! یہ معمولی سی پنسل دھوکہ ملتی ہے، ہم بہت احتیاط سے استعمال کرتے ہیں۔“

دروغی نے موقع پاتے ہی ساری تراش کر پیچک دی۔ اس سے پہلے کہ وہ ہڈی کے ساتھ بھی کچھ ایسا دیا کرتا وہ تیزی سے بڑھی۔

”یہ ادھر دے دو۔“

درختی نے کڑوی تھری چڑھائی۔

”یہ کمرے قبرستان نہیں، جہاں مردے لانے گئے ہو۔“

وہ کہہ کر باہر کی جانب بڑھا۔ وہ پیچھے پیچھے ہانکتی ہوئی مینا کی اعزاز میں اس پر جھپٹی مگر اس نے دروازہ کھولتے ہی بہت دور دُری میں اچھال دی۔ غصہ کی سانسیں رکیں، منہ وا ہو گیا۔

”یہ۔ یہ کیا کیا تم نے درختی۔ کتنی ہانکتی تھی وہ، جانتے بھی ہو گا کچا دالے کیا کریں گے اب میرے ساتھ۔“
اس کی بے بسی پر درختی نے غصہ لانا چاہا مگر پانی سے بھری ہیزا انھیں قہقہے میں پھنسے منہ کھڑا کر گئیں، ہیزا پھاڑوں کو چٹکی مار سلا ب میں پھتے دیکھا تھا، اس کے دل کو ایک دھکا سا لگا تھا، کہا تو اس نے کچھ نہیں مانا سراسر جھٹک کر وہاں سے ہٹ گیا۔ ہاں ایک ملامت سی محسوس ہوئی تھی جسے وہ نکاہر ہونے دیتا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اپنے دل کا حال کیا تھا۔ اسے کس بات کا ڈر ہے۔ اگر وہ کچھ ڈاکٹر بن ہی گئی تو کیا پلٹ کر آئے گی، کبھی نہیں اور اپنا بچپن کی جگہ پر غصہ کو وہ کھور کے ہاں لگن۔ □



خانانی حکیم کو بھی اس کے پلٹنے کی غرضی۔ خانانی بھی غیلاؤں کا درس دیتے، ذریعہ نکت ایک ہی بات کرتی۔

”امروز خان نے تمہاری خانیت دی ہے، پڑھ لکھ کر اس کے سر پر خاک نہ ڈالو نا۔“

امروز لالہ کی خاموشی کا ہیں اسے اچھا یہ کتنی حسین اور جس کی خاطر اسے سب داہیں لانا چاہتے تھے اس کی ہٹ دھرمی۔ اسے اپنی قسمت پر رونا آیا تھا اور اس دن وہ زندگی بھی نہ تھی، جب انٹرنیٹ نے ہون داہیں مانگی اس سے کوئی جواب بن نہیں پایا۔ اطہر کو جیسے ہی اعزاز ہوا غصہ ہون کے گئی تھی اور داہیں نہیں دے رہی اس نے انٹرنیٹ سے بار بار مانگی شروع کر دی۔

”مجھے پڑھنی ہے، لیں اس سے، مجھے ضرورت ہے۔“

ہادی کوئی آراء پر وہ نے بتایا کہ کوئی مل لا محوطے حب اس نے انٹرنیٹ سے بات خانانی۔

”سواری سر، تو کس غصہ سے میں نے نے لی تھی۔“

غصہ نے خیرت سے اسے دیکھا۔ وہ پرے احتاد کے ساتھ جھٹ بول کر انٹرنیٹ کو مطمئن کر چکا تھا۔ پڑھ

کردو چار دن میں لوٹا دے گا، بجلی بعد میں اس نے غصہ کو لا پر دائی پر اطمینان کوڑھائی پر بڑھا تھا۔

”شرم کرو تمہاری کلاس فیلو ہے، سادہ کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔“

اور انٹرنٹ کو جانے کیسے فائن دے کر چپ کر دیا مگر غصہ کو پوری کلاس اور منچرز میں سکی ہونے سے بچا لیا تھا اور ایسے کتنے کام اس نے کیے تھے، مہرج تھیل کر دانا تو ایسا کوئی بڑا کام بھی نہیں تھا۔ صرف ہادی نے اتنا ضرور پوچھا تھا۔

”کیوں؟“

وہ چپ رہی۔ ہادی نے سادی پونٹ لسٹ چپک کی تقریباً اس میں سادی اس کی فریڈ ڈی تھیں۔ اطمینان کے نام پر اس کی ابھی بیٹھائی یک دم سیدھی ہوئی، سکرے ہوٹ کھلے، اس نے اپنی ٹیک اٹار کر شیشے صاف کرتے عام سے لکچ میں پوچھا تھا۔

”اٹمر Irritate (تک کرنا) کرتا ہے آپ کو۔“

وہ چپ ادھر ادھر دیکھنے لگی۔ ٹیک ہمارے عاتے دھما سا ہوا۔

”انجلی کی کمر میں سب سے چھوٹا ہے، کچھ لڑا لڑائی۔ بہر حال میں سمجھاؤں گا اسے۔ اور پونٹ کا کوئی انٹو نہیں ڈونٹ دری پہنچ ہو جائے گا۔“

وہ کہہ کر ہانچا تھا پونٹ سے اس کی ہوا چال کو دیکھنے غصہ لے کر ہر سو چا تھا۔

”کتنے ایسے ہوتے ہادی جیئن۔۔۔۔۔“ اس نے خود کو فورا سز دھن کی کہ

”تم اس کی اچھائی کیوں سوچ رہی ہو غصہ؟“



پونٹ تھیل ہونے میں زیادہ دن نہیں لگے تھے، بہت آرام سے ہوئے اور کام معمول پر ہوتا رہا تھا۔ وہ بھی ایک عام سادہ تھا۔ کھینچ کل شروع ہوتے ہی آپس ڈیل ہادی کے بجائے مرینوں پر ہونے لگی تھی۔ آپس کے سلسلے میں معلومات اکٹھی کرنے وہ اسٹاف روم میں کچھ مرینوں کی فائل لیے بیٹھی تھی۔ ڈاکٹر ہادی ٹائٹ ڈیوٹی کے بعد ہاسٹل کے لیے نکل رہا تھا۔ اسے وہاں بیٹھا دیکھ کر کیشین گیا، چائے کے دو کپ لیے اس کے پاس آ

جیسا۔ اٹنی جا بڑھتا کہ دیکھ کر وہ اپنی چادر دست کرتے مگرانی۔

”کوئی ٹینکس۔ میں بریک فاسٹ کر چکی ہوں۔“

”لیکن یہ تو ڈاکٹر کا ایجنڈا ہے۔ بکڑیں۔“

شکریہ میں سرخم کرتے اس نے کپ بکڑا اور چسکیاں بھرنے لگی۔

”کیا دیکھ رہی تھیں آپ؟“

”آج آجی ہے کل فارماکالوژی (دوا) میں نے سوچا پشٹ فائلنگ چیک کر لوں۔“

ہاوی کو جتنی معلومات تھیں وہ اس بارے میں دہرایا، پھر کچھ دیر بعد خام سے انداز میں پوچھا۔

”آپ کا فائل ایئر کیلیٹ ہو رہا ہے۔ اس کے بعد کیا ارادہ ہے؟“

لہجہ کو جھٹکے چہرے پر سکون کی چمک تھی۔

”ہاؤس جا ب۔“

”وہ تو یقیناً میرا مطلب ہے آپ کی پریسٹ انجی پریسیب آکر ہے۔ تو؟“

(طیبہ) امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن (امریکن میڈیکل ایسوسی ایشن) اس کی آنکھیں پھٹکی ہوئی تھیں اور ٹی میں سر ہلایا تھا۔

”وائے۔ یہ تو آپ کا کریڈٹ ہے، اس سال صرف چار بچے انٹاکس ہوئے ہیں جن میں آپ شامل ہیں،

اتنی بڑی اپروپرائٹی آپ چھوڑ دیں گی۔“

طیبہ کے لیے بچے سر دھڑکی ہاوی گئے کو تیار رہتے ہیں جنہی کے ہاتھ پڑتی ہوں وہ سفارش تک اور جسے

تھالی میں رکھ کر پیش کیا جا رہا ہو وہ سر دوا کر کے ساتھ چپ تھی۔ اب نیسے بتاتی اس کی فیملی نے یہاں تک جانے

کیسے پہچان دیا۔ امریکہ اس کا خرچہ کیا ماں کے سارے خاندان کا خرچہ بھی اٹھانے کا کہے، اب بھی کوئی جانے نہ

دے۔

”انسان اپنے خواب خاندان سے بہت اونچے رکھے بھی کیوں۔“ ہاوی نے بھی زیادہ نہیں کر دیا، لہجوں کی

خاموشی کے بعد آہستگی سے پوچھا تھا۔

”ایک بات کرنا چاہتا ہوں آپ سے؟“

اس نے گردن اس کی جانب گھماتے سوالیہ لہجہ اٹھائی تھی، ہادی ملی بھر بیز آنکھوں کا صبرداشت کر سکا، پھر سامنے دیکھنے ہوئے پوچھا تھا۔

”آپ کسی سے کیلیڈ ہیں؟“

بیز آنکھیں قحیر سے پوری کل گئیں۔ دو فوراً سنبھلا۔

”میرا مطلب ہے کہ۔“ اس نے اپنا چوڑی کمانی کا چشما ہار کر صاف کیا، بات کرتے اسے کچھ الجھن ہوئی تھی لیکن آج وہ کر لینا چاہتا تھا۔

”میری ہاؤس جاب کپلیٹ ہو رہی ہے اور ہر ماں باپ کی طرح میرے والدین بھی چاہتے ہیں میری شادی کر دی جائے۔ ہماری ایجوکیشن تو تاحیات چلنے والی ہے، اس کی مشائش پر ٹیکس کے ساتھ ہوتی رہے گی اور میری خواہش یہ ہے، میری زندگی کا سزا آپ کے ساتھ گزروے۔ تو۔۔۔“

”تو۔“ کے بعد اس کے سخی خیر دیکھنے کو وہ کبھی ابھی نہیں تھا لیکن اسی حد تک تعلیم حاصل کر لینے کے بعد بھی غصہ کے اندر کی پہاڑی لڑکی مری نہیں تھی، ”آج واحد میں اس کے سیدہ گالوں پر سرخی لہرائی، محض بالکیں لڑ کر اٹھیں۔ وہ خالی کپ بیٹ پر رکھتے ہوئے کہہ گئی۔

”ایم آل ریڈی اٹکھیڈ۔“

ہادی کے لیے یہ بہت بڑا جھٹکا تھا۔ تقریباً اس کی ساری چلی کو جان گیا تھا۔ لینے پھوڑنے کے دوران ان پانچ سالوں میں اس روز لالہ سے بات چیت بھی ہوئی تھی۔ باقی سب کا ذکر بھی کی ہادی مگر ٹھیکیر کا کہیں ذکر نہیں تھا۔ اس نے صندوق اچکا کر اسے جاتے ماہی سے دیکھا تھا۔ کور پیلو کی جانب بڑھتے قدم غصہ کو خود بھی جھکے جھکے لگے، جیسے اپنے کہے پر اسے خود بھی یقین نہ ہو، لیکن اسی لمحے اس پر ادھر سے گزرا تھا۔ جیسے گوری بات اس نے نہیں سنی ہوگی، صرف آخری منٹ سے ہی اعذارہ لگا لیا کچھ آج کل اس کے دوست بھی کہہ رہے تھے۔

”تمہارا بھائی اور ڈاکٹر غصہ آج کل بہت ساتھ ساتھ رکھائی دے رہے ہیں۔“

وہ ہادی کے قریب آنے کے بجائے حیرتوں سے غصہ کی جانب بڑھا۔ وہ کور پیلو کے آخری سرے پر تھی۔

”تم کیسکچیزی۔“

اس نے گردن ہلاتے ہوئے استہمامیہ منہ نہیں اٹھا نہیں۔

”کچھ عرصہ پہلے آپ کا پرنٹ اچانک سے تبدیل ہوا تھا۔ جانتا یہ ہے وہ ہادی نے تبدیل کروایا تھا یا ہادی کے لیے تبدیل کروایا گیا تھا۔“

”آپ کہنا کیا چاہ رہے ہیں۔“ وہ جتنی سے بولی تھی۔

”بھیل۔“ اس نے کندھے اچکائے۔ ”اس پرنٹ میں آخر مسئلہ کیا تھا؟“

”آپ۔“ اس کے غصے اعداد پر اطہر کی آنکھیں پھیل کر بھگی۔

”آپ مسئلہ تھے، میں آپ کے ساتھ ہر کام نہ کر پاتی۔“

اطہر کے قوسارے بدن میں گرم لہر دوڑ گئی، چبا چبا کر بولا تھا۔

”آپ نے مجھ کو رکھا ہے مجھ کو قرضہ کلاں، آوارہ نکلا۔ میں اچھے بھوں کو مت نہیں لگاتا اور آپ کی اوقات

ہی کیا ہے۔“ اس نے گردن میں بھونک اٹلیں اس کو پکچھ کر اتارا اور اوڑ آل کی پاٹ میں اڑسا۔ ”کوئی جلی

بیک گراؤ پر دلنے کے لیے میرے بھائی کو بیڑی مست حاکمیں، وہ بہت رحم دل ہے، بھولی صورتوں پر ترس آ جاتا

ہے، اس کے ترس کو محبت مت سمجھئے گا۔ رات۔“

گجنت نے سر سے پاؤں تک اسے ایک نظر دیکھا، استہمامیہ منہ نہیں اٹھا نہیں۔

”اور کچھ کہیں گے آپ؟“

”کہہ ہی نہیں، میں بہت کچھ کر بھی سکتا ہوں۔“

”شوق سے۔“ وہ کہہ کر تیز قدموں سے ایک وارڈ میں داخل ہو گئی تھی۔ پیچھے دھمکا کر دیا۔



اطہر کے چہلے آئے محسوس نہیں ہوئے تھے جتنا ہادی کا دیمیا لہجہ اس پر کارگر ثابت ہوا، کتنے دن وہ شعوری

کوشش سے ہادی سے کھڑائی رہی مگر اندر کچھ کلک رہا تھا۔ چاچے ہوئے بھی اس کیفیت کو کوئی نام نہیں دے پائی

تھی۔ اس دن وہ ہاسپٹل کے گراؤڈ میں بیٹھ کر کچھ پڑھنے کے لیے بیٹھی تھی لیکن ذہن بے طرح منتشر ہو رہا تھا۔

جب ہی وہاں ہادی بھی آ بیٹھا، وہ اس کے بیٹھے پر چگی خرد مگر کاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ بیٹھ کر آگے کو ہو کر بیٹھا کچھ دیر بعد اسٹگی سے بڑھ لایا۔

”مس فحشہ! آتا ہوں آپ نے بتایا تھا آپ کے تایا کے دو بیٹے ہیں، ایک تو آپ کے بہنوئی ہیں امروز لالہ، دوسرے۔“ وہ رک کر ڈوسنی سالتے دیکھتے ہوئے پوچھ رہا تھا۔ ”کیا وہ آپ کے.....؟“

فحشہ نے آنکھیں جھٹی سے بند کیں، اثبات میں سر ہلایا۔ ہادی کے ماتھے کی ناگواری لہجے میں دور آئی۔ سال پہلے اسپورٹس کالاب اس نے دروغی کو جب دیکھا تھا جب وہ فحشہ کو گمر لے جانے آیا تھا، اس کی چال و حال، دیکھنے، بولنے کا انداز ہادی کو بہت عجیب لگا تھا۔ خاص کر جب اس نے اسٹال پر کھڑی لڑکیوں کو اپنے کلاس فیلوز کے ساتھ بے لگاری سے باتیں کرتے دیکھ کر نفرت سے ناک چڑھائی۔

”ماں باپ کہتے ہیں ڈاکٹر بین رہی ہے۔ اور تو یہاں مل رہی ہیں۔“

ہادی کا پیچھا تھا اس کا ستونہ ڈالے۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بھانپا اور میں اپنی فحشہ اپنی چیزیں اٹھائے اس کے پاس آ کھڑی ہوئی، پھر چلا تھا یہ اس کا کزن ہے اس کے بچھے جتنی فحشہ کو کچھ کر دے تا سنانہ سوچتا رہا۔

”کیا کہتے ہیں گڈریں میں بھی کس ہوتے ہیں؟“

اس وقت فحشہ کا اقرار میں ہوتا سراسر نہ تھا۔

”کیا آپ سمجھتی ہیں، یہ ایک پرنسٹن ٹیگ ہے؟“

”ہمارے ٹیگ ہمارے بزرگ ہاتے ہیں۔ وہ جو کہتے ہیں انہیں پرنسٹن ٹیگ ہے۔“

”لاڑی تو نہیں بزرگ ہر بار پرنسٹن ہوں، انہیں کیسے سمجھایا جاسکتا ہے، قابل کیا جاسکتا ہے آپ پر ہی کسی ہیں فحشہ، وہ کسی صورت بھی آپ کے قابل نہیں۔“

”ہمارے ہاں قابلیت کا معیار روایات ہیں۔ اور پلیز۔“

وہ مزید بات نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن ہادی آج بہت کچھ کہنے بیٹھا تھا۔

”آپ ایک ڈاکٹر ہیں، چراپے ساتھ منسٹر نہیں، وہ اس چٹے کے ساتھ کیسے سلیر ٹی دیکھا سکتا ہے۔“

اس نے اپنے لہجے کی نمی کو قابو کرتے اٹل انداز میں کہا تھا۔

”وہ اکثر ہادی ہم کوئی اور بات کر سکتے ہیں۔“

”بالکل کر سکتے ہیں مجھ، لیکن کیا کروں اس دل کا جو جاسوس ہے مجھے، آپ سے بہت محبت کرنے لگا ہے اور آپ کو میں شائع ہونے نہیں دیکھ سکتا۔ پلیز پلیز اپنے ساتھ انعامِ علم مت کریں۔ وہ شخص آپ کے معیار کا ہرگز نہیں۔“

مجھ نے اسے میکا کی انداز سے دیکھا۔

”پلیز سوچنے کا ضرور۔“

وہ کہہ کر چلا گیا تھا مگر اس کے دل کی دھڑکن بے حد بڑھتی رہی تھی۔



ہادی نے ہاؤس جاب مکمل ہوتے ہی اپنے صنف کے مطابق گورنمنٹ جاب کے لیے اسی ہاسٹل کو ترجیح دی تھی۔ مجھ کی بھی ہاؤس جاب شروع ہو چکی تھی، جیسے ہی اس کے گھر والوں کو پتا چلا تھا، اس کا کورس پورا ہونے میں کچھ ہی وقت رہ گیا خانی جیکس نے شادی کی تیاریاں جیز کر دی تھیں اور داجی نے مال خان کے حصے کی زمین پر ٹیکس بھرانے کا کہا اور غزنی جو گھر کی مرحمتوں اور چھرے فرش ڈولالے میں بہت دلچسپی لے رہا تھا۔ ٹیکس کی قیمتیں بڑھاتھا گواریلوں سے بھر گیا۔

”کیا مطلب ہے، شادی کے بعد بھی وہ باہر رہے گی۔ سوچے دیں داجی، کچھ سالوں بعد دیکھیں گے یہ سب۔ پہلے گھر بار دیکھیے، بچے پالے۔ یہ بعد میں ہو جائے گا۔“

امروز کو اس کی بات پر خیریت بہت آیا تھا کہ شادی ابھی ہوئی تھیں اس جال کو بچوں کے خواب آنے لگے مگر داجی کی وجہ سے اپنا لہجہ قدرے نارمل رکھتے کہا تھا۔

”سب کام ساتھ ساتھ چلتے رہتے ہیں، وہ چرمی کھسی ہے، سنبھال لے گی۔“

چادر کی ہلکے مارے وہ وہاں سے اٹھا۔

”لیکن شادی کے بعد میری مرضی۔“

اس کے لفظ سچ میں رہ گئے تھے، ہاتھ روم سے صفورا جیکم کی خطرناک چٹائی آئی تھی۔ ہاتھ روم میں سارا فرش

تو ذکر بھری باتیں لگوائی گئی تھیں، مضمون کا پادشہ پھلا۔ دونوں بیٹے بہت مشکل سے ہماری بھر کم ہاں کو اٹھا کر باہر چارپائی تک لائے۔ ان کے کمرے میں کسی صورت کی نہیں آ رہی تھی۔ خدشہ تھا گھٹنے کی ہڈی ٹوٹی ہے۔ سردار خان جراح کو گھر لے آیا جو صورت ٹوٹی والا برقع لے کر گھر سے نکلتی ہو وہ چارپائی پر جراح کے سامنے لٹھی تھی۔ اس نے پہلے اس کی ٹانگ کو ڈھکے ڈھکے ہی جاتھا پھر ”گٹنا ٹوٹ گیا ہے“ کہہ کر کچھ بھٹایا، پٹیاں اپنے سامان سے نکالنے لگا۔ جب اس نے بوڑھی مضمون کی شلوار کا پانسفہ اوپر کو سر کاٹا، اور غزنی کا چہرہ ایک لخت چپ گیا۔ اس نے آنکھیں سختی سے پھینکیں اور وہاں سے ہٹ گیا۔ جتنی ہاں کو تکلیف تھی اسے ٹوٹی ٹانگ کے ساتھ چھوڑا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ کسی مرد کے سامنے اپنی ہاں کا برہندہ حصہ دیکھنا بھی مشکل تھا۔ اسے زندگی میں پہلی بار احساس ہوا مورتوں کے علاج کے لیے عورت معالج کا ہونا بھی ضروری ہے۔

مضمون چارپائی سے لگ گئی تھی۔ جراح روڑو دیکھنے آتا تھا۔ بخشتہ کو چٹا چلا اس نے چھٹے ہی کہا تھا۔ ”کیا مطلب ہے؟ آپ کو کون نے ایسے ہی ان کی ٹانگ بندھا دی۔ ان کا انکمرے کرواتے، پھر چٹا چلا۔ آپ انہیں فوراً یہاں لے آئیں۔“

انکمرے کا سن کر دروغزنی کے کان حریف چپ کئے، یعنی اب تصویر بھی مرد سے اترا دیں اور جانے کیا کیا ہوگا کیونکہ ایک مہینہ ہو گیا تھا جراح کے علاج کو کوئی فرق نہیں چڑھا، ہاں نے بخشتہ کو کون پر کہا تھا۔

”کیا تم نہیں یہ سب کر سکتا۔ مطلب مرد کے (ہاں) کی سرخیم پٹی، تم بھی تو کب سے ڈاکٹر بن رہا ہے۔“

وہ ہنسی ہی نہیں تھی۔

”پہلی بات تو یہ، میں صرف ابھی ایم بی بی ایس ہوں اسٹڈنٹ نہیں، دوسری بات انکمرے کرنے کی پڑھائی شروع سے لگ ہے، وہ وہی کرتے ہیں جنہوں نے پڑھا ہو۔“

”یعنی کر مرد۔“

”فہمیں اب لڑکیاں بھی اس شعبے میں ہیں۔ شکر ہے کچھ لوگ ہیں، جنہیں اب سمجھ آنے لگی ہے، عورت کی ضرورت کس کس شعبہ زندگی میں ہے۔ خیر تم چاہتی کو یہاں لے آؤ۔ ہو جائے گا۔“

مضمون کا علاج وہاں بہت اچھا ہوا تھا، کچھ مہینے پلاسٹر چڑھا، پھر پہلے کی طرح چلنے پھرنے کے قابل ہو گئی

تھیں۔ اس سب سے درد خیزی میں یہ تہہ ملی آئی تھی اس نے بحال چا چا کی زمین کا ساتھ اپنے حصے میں آنے والی زمین کی ہسپتال کی تعمیر میں شامل کروائی۔ اس کی نگرانی میں حدود سرحدی تیزی سے کام کر رہے تھے۔



آنکھوں کے کناروں پر حیرتا اس کا بچپن کا خواب جیسے جیسے تکمیل کی جانب بڑھ رہا تھا اسے بے پناہ خوش ہونا چاہیے تھا لیکن اچھانا سا دل چاہتا تھا یہ کبھی مکمل ہی نہ ہو، دن میں کئی بار خود کو جھٹاتی کہ وہ خوش ہے اور ہر بار جھٹانے کے بعد اس کی حسیں سوا ہو جاتی۔ پانچوں سالوں میں ڈسٹنکشن (امتیازی گولڈ میڈل) لینے والی بھرتی کو مشکل ترین پڑھائی نہیں تھا مگر کبھی، جتنا آنے والے لمحوں کی سوچ نے تھا دیا تھا۔ جس دن ڈاکٹر ہادی نے کہا تھا۔

”ڈاکٹر بھرتی امیر اللہ بن اسحاق عرش کا اسکا لرشپ آگیا ہے، اور میری شدت سے خواہش ہے، میرا دل آپ کا انٹرسٹ آپ ہی رہیں۔“

”کب جا رہے ہیں آپ؟“

اس کے بکرا لگ سوال پر وہ پیکا سا ہوا۔

”چھ سات ماہ لگ جائیں گے، دل میں لیکن یہ میری بات کا جواب نہیں ہے۔“

”ڈاکٹر ہادی اجاری زمین کیوں میں بہت کی باتوں کے جواب نہیں ہوتے۔“

دوا ٹھک کر جانے لگی۔ وہ بولنے ہوئے ساتھ اٹھا تھا۔

”لیکن مجھے اس بات کا چاہیے۔ پلیز روایات کی بیعت اپنا لے بہت چڑھائیں۔ میں آپ کے جواب کا منتظر ہوں۔“

اس کے چند منٹے لا شعوری طور پر درد خیزی اور ہادی کا سوا نہ کرنے پر اس کا سناے دل کی چال و حال، اخلاق، اعزاز، سوچ اور مستقبل۔ ہادی ہر بار آگے آ کر ہوتا، وہ سختی سے آنکھیں بند کر کے خود کو ہادو کرداتی تھی۔

”نہیں، میں کبھی کسی کو سونپنے کی۔“

اپنے اندر چھری جنگ کا اعزاز اسے اس دن ہوا جب وہ مصر کی نماز چڑھ کر وہاں گئے تھے مگر اس کی عمر وہ لاکھ

کافون آگیا۔ جائے نماز پر بیٹھے ہوئے اس نے فون اٹھایا۔

منفردا جاہلی کی خیر خیریت پوچھ لینے کے بعد معمول کی باتیں کرتے امروز خان نے کہا تھا۔

”تم بتا رہی تھیں تمہارا کورس پورا ہونے والا ہے، پھر کب لینے آؤں تمہیں؟“

”اُسکی بھی کیا جلدی ہے لال، جب پورا ہوگا بتا دوں گی۔“

اس کے جواب میں وہ آرام سے بولے تھے۔ ”مجھے نہیں وہ خوشی کو جلدی ہے شادی کی، سب جاری ہوگئی ہے بس تمہارا انتظار ہے۔“

سننے ہی اس کے تن بدن کی گری لہجے میں اُڑی۔

”اسے کب جلدی نہیں تھی لال۔ اس کی جلدی کی خاطر میں اپنی تعلیم تو داؤ پر نہیں لگا سکتی ہوں۔“

ایک لخت اس کے فون بند کر دینے پر جہاں امروز خان بری طرح چوگے تھے وہاں وہ خود اس سے زیادہ چونکی اور بھراپے گھٹنوں کے گرد ہانڈ لپٹے فوراً زور سے روٹی تھی۔

”کاش میں بھی ذر بخت جیسی ہوتی، ہر فعل اپنی قسمت کچھ کر شا کر رہتی۔ میرے اللہ مجھے اپنی تقدیر کو خوشی خوشی قبول کرنے کی طاقت دے دے۔ ایک طرف میرا مستقبل ہے، ایک طرف میری روایات، میں نہیں چاہتی ان دونوں کے بیچ سزاوار میری تعلیم بن جائے۔“

آج واحد میں اس کی لگا ہوں کے سامنے زمینوں پر کام کرتے مگر رنج چاہا کے ملے کچلے بچے محسوس ہوئے، اس کا سر ٹرانس کی صورت لٹی میں ہلا تھا۔ ذر بخت کی دو چارٹی تجارتی ٹیلیں اسے اپنے گرد کھڑی نظر آئیں۔ تری لگا ہوں میں سوال لیے۔

”مڑے اتم ہمیں ادھائی دوکانے کے لیے بیٹھیں رکھ رہی تھیں، ان انگلیوں جیسے دیوار کیوں بنا گئیں۔“
نارنجی چھانک جیسے لب آپس میں بیست ہوئے ناک کی ٹہنی، مڑکتے ہوئے اس نے اپنی آنکھیں پھٹلی کی پشت سے رگڑ ڈالیں۔

”مجھے تو ان کے لیے رستہ بنانے لگی تھی اور دیوار بنانے میں لگ گئی، یہ سکھایا تعلیم نے تجھے؟“

پانی پی کر اپنے بھراپے لہجے کو تازہ کرتے اس نے امروز خان کو کال ملائی۔

”جی لالہ، مشکل کٹ گئے تھے۔ میں نے آپ کو بتانا تھا کہ اس تو پر رانا ہونے والا ہے لیکن کچھ تاخیر لگ جائے گا، مجھے اپنی کیئرٹس کر دانی ہے، پھر اگلے مہینے کا نوڈیکشن ہے اس میں استاد اور میڈیٹر بنے ہیں، بس کچھ دو تین ماہ ہیں، پھر میں آ جاؤں گی۔“



وہ اپنے دل کو مکمل طور پر سمجھا چکی تھی اور اس پر کاربند رہنے کے لیے ڈاکٹر ہادی سے جان کر گریز کرتی رہی۔ یہ اس رات کی بات ہے جب ٹائٹ ڈیوٹی دینے کے بعد دو گھنٹے کے لیے سٹے والے آرام کے بریک میں وہ سٹاف روم میں رکھے لکڑی کے تخت ٹیبل پر لیٹی تھی۔ اس کی آنکھ لگے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ ڈاکٹر بریرہ کے رونے کی آواز پردہ ہٹا کر اٹھی، اسی وقت روم میں کئی سینئر ڈاکٹر ابھی اس کے ساتھ داخل ہوئے تھے جن میں ڈاکٹر ہادی بھی شامل تھا۔ مختصر ڈاکٹر بریرہ کو سمجھا رہے تھے۔

”ڈاکٹر بریرہ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔ ہمارا پھر جیسا ہے پہلے تو کمر والے خود ڈاکٹر بننے کی سر توڑ کوشش کرتے ہیں، جب بات ہاتھ سے نکل جائے تو وحشت ڈاکٹر کے سر گانے لے آتے ہیں۔“

”سرور مر گیا، اس کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اس کی بیوی ہمیں بددعا نہیں دے رہی تھی کہ ہمیں اپنی فیس سے غرض ہے، ہماری لاپرواہی سے اس کے مہاں کی لڑکھ ہوئی۔“

ڈاکٹر مریم اور ڈاکٹر راجا جو پہلے ہی ڈاکٹر بریرہ کے رونے پر پریشان سی تھیں، رو دہلیسی لے کر میں بریرہ کے رونے کی وضاحت دینے لگیں۔ اچھا آواز کی ناسف سے بکھار دیا گئے ہوئے۔

”ڈاکٹر صرف وسیلہ ہے اور دوسلوں کی سلامتی کی دعا کرنی چاہیے لیکن نادان لوگ ہمیں خدا سمجھ لیتے ہیں۔ کیا دوسرے شعبہ ہائے زندگی میں کہیں نقصان نہیں ہوتا ماضیان کی بھائی ہوئی شہین کو ٹھیک کرنے میں انسان غلطی کر جاتا ہے، اللہ کی بھائی ہوئی شہین کس قدر پیچیدہ اور ہر ایک دوسری سے بے حد مختلف، کیا یہاں انسان سے غلطی نہیں ہو سکتی۔ دل کے مریض کو پمپ کرنے میں مریض کی چند ٹوٹی پھلیاں لوگوں کو دکھائی دے جاتی ہیں، جو زور لگانے میں ڈاکٹر کے کٹھمرے اتر جاتے ہیں، وہ دکھائی نہیں دیتے، کیونکہ دوا دیکھنے والے دانتے ہمارے پیوی بچے پاس نہیں ہوتے۔ ہزاروں مریضوں میں کتنی کی چند دھندھکاری فیمیں اور کوتاہی گتی ہے، جو ہزاروں صحت یاب

ہو کر گھروں کو جاتے ہیں، ہمارے ہاتھوں میں جو روز ختم ہوتے ہیں، تب ہماری نیند سے خالی آنکھیں دکھائی نہیں دیتیں۔ ڈاکٹرز کے ہاتھ، دماغ آنکھیں، دنیا کے قیمتی ترین ہاتھ، دماغ، آنکھیں ہیں، جو اللہ کی بنائی مخلوق کی بہتری میں بہر حال معروف ضرور ہیں۔ چلیں شاہاش مت ہاتھ دھوئیں اور چائے پیئیں۔ ہمارے لیے یہ اعزاز بہت ہے لوگ بے شک ہمیں گالیاں دیں لیکن اپنے دکھ تکلیف میں آتے ہمارے پاس ہی ہیں اور ان کے دکھ سنے کے لیے اللہ نے ہمیں چنا ہے، ہمارا عہد ہے، انہیں ٹھیک کرنے کی ہم پوری کوشش بھی کریں گے تا حیات۔“

باقی ڈاکٹرز اس کے شانے چھپتے ایک ایک کر کے چلے گئے مگر ڈاکٹر ہادی وہاں ہی تھے، اس نے کن آنکھوں سے جنت کی نیند سے حسی حسی گلابی آنکھیں دیکھ کر کہا۔

”چلیں، آنکھیں میں آپ کو چائے پلاتا ہوں۔“

”نہیں۔ جنت تو اٹھارہ گھنٹے بھاپ سوئی تھی، میری سہ سے اٹھ گئی۔ سو جائیں جنت۔“ میرا دھرم نہ ہوئی۔

اس نے اپنا ہاتھ میری آنکھوں پر رکھتے ہوئے دہائیے۔

”نہیں اب نیند نہیں آئے گی۔“ اور قریب رکی ایک اٹھا کر گالی۔

ہادی فوراً بولا۔ ”چائے یہاں ہی منگوا لیتے ہیں۔“

بچوں کے چائے لاتے ہی مریم کو یاد آیا تھا۔

”مجھے تو دارو ڈاکٹر کا دینا ہے۔“

جب ہی میرا دورہ ڈائے گرم گرم چائے طح میں اٹھ بیٹا۔

”ہاں یاں ہماری امیر جنسی میں ڈیوٹی ہے۔“

”لوگ ایک مریض کے ساتھ صرف ایک رات جاگ کر جاہر کرتے ہیں، وہ کھکھے، وہ پریشان ہیں،

حالانکہ وہ ان کے اپنے ہوتے ہیں اور ہم ہر روز ایسے ہی تمام مریضوں کے ساتھ کھاتے، جاتے میں رات کاٹتے

ہیں لیکن ہماری کوئی قدر نہیں۔ لوگ ہمیں نہیں دے کر روٹ بکھ لیتے ہیں۔“

ڈاکٹر ہادی کے حواسف لہجے پر جنت مسکرا دی۔

”کیا کہا جا سکتا ہے، ہم نے اپنی مرضی اور خواہش سے یہ شعبہ چنا ہے۔“

”بالکل۔ لیکن کچھ قدر تو ہونی چاہیے۔ انہیں کوئی نہ کرے مگر میں خود اپنی قدر کا احساس ہونا چاہیے۔“
اس کے سوال پر رک جانے پر مجھ پر کچھ خفیا ہوئی۔ کچھ وقت کے بعد وہ کہہ رہا تھا۔
”مجھے آپ کے علاقے کا ایئر میس چاہیے۔ میرے ہر شے ایک کوشش کرنا چاہتے ہیں۔“



ہادی نے جب مجھ کا نام اپنے والدین کے آگے رکھا انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا صرف والد نے اتفاق چاہا تھا۔
”اسطہر کی کلاس فیلو؟ جو ٹوٹی دستکھن ہے۔“

ہادی نے اذیت میں سر ہلایا۔ ”کوئلہ میڈلیسٹ ہادی بہو بنے ہمارے لیے امتحان کی بات ہوگی۔“
باپ کا سراپا اسطہر کو بٹھا گیا، اسے کچھ نہیں لگی کس طرح وہ چیخو و ہادی کے دروازے سے مٹائے۔
”جی بالکل۔ اس کے امتحان میں چھ ماہ کی جھلا کا ہوا خاندان بھی شامل ہے، وہ بھی باور کیجے گا۔“
”اسطہر۔“ اس کے باپ نے سر زخمی کی۔ ”زندگی ہادی نے گزاری ہے، ہمیں کوئی اعتراض نہیں، جس میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔“ ہادی سے کہا۔ ”تم ایئر میس کو ہم ضرور جانیں گے۔“
اتفاق اسے چاہا وہ انک کے قریبی علاقے سے ہے لیکن ایئر میس لینے کا موقع نہیں مل رہا تھا۔ اب موقع ملنے ہی اس نے ناگوارہ فحش سے اسے دیکھتی رہی۔

”مجھ سے ابھی سر مارا کیا جاتا کر کے ہیں، ہمارے باجھ، دماغ، آنکھیں بہت جیتی ہیں۔ چاہتے بے سول نہیں ہیں، ان کی کوئی قیمت نہ لگے، میں نے آپ کا کزن دیکھا ہے، کہ اس قابل نہیں کہ آپ کی قدر جان سکے، میں آپ کو آپ ہی کے ہاتھوں ضائع ہوتے نہیں دیکھ سکا، پلیز پلیز۔ ایک کوشش کر لینے دیں، مگر جو ہماری تقدیر رنگ دکھائے، مجھے منظور ہے۔“

ہوش انداز کی جانب بچنے وہ سکتے کی صورت اسے دیکھے گی، مگر کچھ بولے وہاں سے اٹھ کر دروازہ کی جانب بڑھنے لگی۔

”میں نے کچھ بڑھا ہے آپ سے۔“

زرد، دوسرا تازہ ہوا کے سبب تروتازہ لگائی سا۔ اس پر عام ی کوئٹیشن لگودی تھی۔

”فیصل! آپ کا۔“ فحش نے ایک دوہرے سے ڈراٹھک ساف کر کے ٹھیک کی، برہ نے یک دم مشورہ دیا تھا۔
”فحش! اگر ڈرگ والے میں رینل سکرینٹ چکاویں، پوسٹر کال لگے گا۔“

مریم اور روانے فوراً توالوں کی طرح تائیدی سر دھتا، فحش چائے کے سیپ لیتی اثبات میں سر جلاتے کہنے لگی۔

”لیکن اس وقت سکرینٹ کہاں سے آئیں گے، ہم ابھی تو آئے ہیں ہاسپٹل سے پہلے پتا ہوتا کہیں سے لے لی آتے۔“

چانچ بچے کے بعد عام بچوں کو وارڈن گیٹ سے باہر قدم نہ رکھتے دے سوائے ہاؤس جاب والوں کے، وہ آرام کرنے تو ہاسپٹل آئی تھی، باہر جانے کے خیال سے بھی کوفت ہونے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ فرسٹ انجیر کی بیٹی نے فوراً کہا تھا۔

”نیم امیں اپنے ہی آرکوفون کروں۔ شاید وہاں ہے۔“

فحش نے کمر بھر سوچا پھر اپنا فون اٹھاتے کہا تھا۔

”ڈاکٹر ہادی ہاسپٹل میں تھے، ان سے پوچھتی ہوں شاید وہ جانتیں۔“

ایک دو تین کتنی نکل جاتی رہیں، فون رسو نہیں ہو رہا تھا، ہوتا بھی کیسے وہ سینٹر ڈاکٹرز کے ساتھ اوٹی (آپریشن تھیٹر) میں مصروف تھا۔ اس نے بیگ سے ہی کہا۔

”چلیں آپ سی آر سے ہی کہہ دیں۔“

قصہ آج فحش پر مہربان نہیں تھی شاید اسی لیے اس بیٹی کے سوا نکل میں جھٹک نہ ہونے کے سبب اس نے فحش کا فون استعمال کیا تھا۔ سی آر سننے ہی ہوئی تروہ سائیلا۔

”سکرینٹ۔ تم لوگوں نے سکرینٹ کیا کرتی ہے، مگر تو ہوسٹل میں آخر ہونے کیا لگا ہے؟ دماغ ٹھکانے ہیں، صبح میڈ کون (میڈیکل کانفرنس) ہے، پرنسپل تمہارے پر نیچے اڑا دے گا۔ پہلے ہی میڈیکل کالج کی بدنامی ہو رہی ہے۔“

”اور ہوا ہمیں چائیکس اور دو بھی دو ڈنیاں، کسی بھی طرح، ابھی باقی وقت۔“

سی آر کا دل کیا کچھ ملا کر دے آئے اچھا ہے شن ہو کر پڑی رہیں گی۔ بڑی جھک جھک کر جس جس کلاس میں،
میں کون میں بھی انہوں نے کب ہی ڈالنی ہے، مگر پریشانی تھی آخر انہیں بیٹھے مٹائے سو بھی کیا سگریٹ پینے
کی، جھٹ نے فون نے کرائیں سب بتا ہی دیا۔ وہ فوراً وب سے بولا تھا۔

”جی جی ڈاکٹر جھٹ۔ ہم کسی طرح اربچ کرتے ہیں۔“

رات کے اس پہر کیا دون میں اجازت نہیں ہے لڑکے کرڑا ہل میں قدم رکھ دیں، انہیں بھی سمجھ نہ گئی کس
طرح سگریٹ ان تک پہنچائیں۔ اگر قدرتی طور پر ڈاکٹر اطہر میڈکون کے سلسلے میں ان کے پاس کچھ ماڈلر چیک
کرنے نہ آئے ہوتے، جھٹ کے نام پر جو گے اور دیک کر پوری بات بنی۔

”ہاں تو یہ کون سا مشکل ہے آپ لوگ کلاس فیلو ہو کا آنا ہے۔“

پھر کچھ سوچ کر ”جین نم لڑکے ہو کام کے بدلے، کچھ دے تو دکھائی۔ چلو ان سے کہو، جس کے فون سے
آرڈر ہوا ہے وہ خود گیٹ پر لینے آئے۔“

فرسٹ ایئر کا بچہ ہنگامہ کر بولا۔ ”بھائی وہ سبتر ہیں، ہم کیسے کہہ سکتے ہیں۔“

”جیسے اس نے آرڈر دیا ہے، رتب سے کچھ ٹاپل اور کون سا گیٹ سے باہر آنا ہے، صرف اندر رہو کرنا
ہے۔“

بچے نے ڈرتے ڈرتے کہا تو جھٹ میں کرفس دی۔ ”اچھا چلو وہ لڑکی تو کسی میں جاتی ہوں۔“



وہ وہاں پر کچھ ٹاپ کرتی ہوئی گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی، گیٹ کچھ ایک ایک ہاتھ میں پکڑے گیٹ
کے اندر کی سمت کھڑا تھا۔ فرسٹ ایئر کے لڑکے ایک کالج یکا سے یہ کہہ کر پکڑا گئے تھے۔

”اے ہلاک، درم نمبر نائن کی ڈاکٹر جھٹ کا بیک کالج رہ گیا تھا، یہ انہیں دیتا ہے۔“

گیٹ کچھ نے کھول کر اوپر اوپر سے اُتار دیا۔ ”اسکوپ، بی بی آپ بڑا اور آلہ ایک دو کالی، اس
نے بیک بند کیا، تب ہی جھٹ سامنے سے آتی دکھائی دی۔“

”اگل میرا کچھ سامان آتا تھا؟“

کبھ نے ایک اس کی جانب بڑھا یا۔ وہ شکر یہ ادا کر مڑی تھی اسی وقت ڈاکٹر ہادی کی کال آ گئی۔ انہوں نے پھوٹنے ہی پر چھا تھا۔

”آپ کال کر رہی تھیں۔ خیریت؟“

”جی جی دو۔“ اس کی وضاحت صبح میں ہو گئی تھی کہ داروان تیز تیز اس کی جانب بڑھتے قدموں سے زور سے بولی تھی۔

”کبھ سے کیا لیا ہے آپ نے؟“

”میں یہ ایک ہاسٹل رہ گیا تھا۔“ اس نے فون چپے کرتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیا۔

”ادھر رکنا نہیں۔“

اس نے آگے بڑھ کر یک دم اس کے ہاتھ سے کبھ پکڑ لیا۔ ”دو دو ہم۔“ کرتی رہ گئی ادھر ہادی پر چڑھا تھا۔

”کیا ہوا ڈاکٹر بھتہ۔“

داروان نے سیکھڑوں میں زپ کھول چھری نکالیں۔ اور آل کھینچے ہی سگریٹ کی ڈبیاں دھپ سے باہر کریں۔ اس کی کوئی وضاحت سنے مٹا داروان زور زور سے چلانے لگی۔

”کیا ہے یہ۔ تم ڈرگ پیلائی کر رہی ہو ہوٹل میں دیکھ لیتے ہیں میڈیکل کے خلاف پراپیگنڈا ہوتا ہے۔ ابھی پرنسپل سے بات کرتی ہوں۔“

”خدا کے لیے میڈم میری بات سنیں۔“ اس کے زور سے چلانے پر داروان زور سے بولی۔

”اب جو منہ مٹانا ہے اپنے پرنسپل اور پولیس کو مٹانا۔“

پولیس کے نام پر اس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ گئیں۔ اس کی کوئی بھی بات سنے مٹا داروان پرنسپل کو کال کر چکی تھی، داروان کی کبھی ان لڑکیوں سے نہیں ملتی تھی۔ اپنے زمانے میں میڈیکل کا میرٹ نہ بننے پر ان کے دل کا ٹکڑا آج تک نہ جاسکا تھا، وہ تو موقع کی تلاش میں ہوتی کسی طرح میڈیکل والوں کو زلیل کر کے اپنے جیلے دل

پر پھوڑا لیں، باب تو موقع ہی انتہا چھٹا، ایک طرف کاغذ لٹس، دوسری جانب ڈرگزر اور وہ بھی ایک پٹھان ڈاکٹر کے ہاتھوں، کم از کم ان پٹھانوں پر تو لگے نہ پابندی آجاتے ہیں شیخ روکنے، اور ڈاکٹر جلد سر ہکا کر بیٹھ گئی، دوسری ہاری پر پٹھان تھا ہوا کیا؟

گرگزر ہوٹل سے ڈرگ ہکاڑی جانا معمولی بات نہیں تھی۔ پرنسپل ہاسٹل سے خاصے قافلے پر تھے انہوں نے اسی وقت تین چار اچھ اوڑی کو گرگزر ہاسٹل بھیجا تھا، ڈاکٹر ہادی بھی ان کے ساتھ ہونے کے سبب آگئے، اسے اطہر کیٹ سے کچھ قافلے پر ملا تھا اور احتیاطیہ سرگوشی کی تھی۔

”سنا ہے تمہاری اور ڈرگ سہلائی کرتی ہکاڑی لگی، خوب اپنے علاقے کے کاروبار کی نمائندگی کر رہی ہے۔“ ہادی نے اسے گھور کر دیکھا تھا۔ ویسے تو اطہر کو کوئی اندازہ نہ تھا، بڑی عمر کے ڈاکٹر کی ٹیم کے ساتھ چلنے ہادی سے باتیں کرتے وہ بھی ساتھ لگ گیا تھا، کبہ نے کیٹ تو کیا کھولا اوپ سے چلتا انھیں داروین آفس تک لے گیا۔



جستہ سر ہاتھوں میں کرائے کا موٹا بلیٹی تھی باقی لڑکیاں دھنا جنس دے رہی تھیں داروین ایسے بلیٹی تھی جیسے اسے سٹائی نہ دیتا ہو، ڈاکٹر کے داخل ہوتے ہی یک دم سکوت سا چھایا۔

”اور کس کس کا اطلاع دی ہے، آپ نے؟“

نورہ کے اچھ اوڑی اتنی دور سے بولے تھے، داروین اگر کسی کا بازو نہ بکارتی تو بچے ہی کرتی جس طرح وہ اپنی تھی۔

”صرف پرنسپل کو۔“ آواز کچکاہکی

”جستہ میری اسٹوڈنٹ ہے، پھر مجھے پہلے کیوں نہیں بتایا، کیا میرا نمبر نہیں ہے آپ کے پاس۔“ ان کا قصہ عروج پر تھا اور داروین کے بعد جب جستہ نے سادی بات بتائی ان کی کبریٰ رنگت تانبے کی مانند تھی تھی مارسٹ انیہرے کسی آرکو بھی فوراً تحقیق کے لیے ادھر بلوا لیا تھا۔

”لیکن اس کا کیا ثبوت ہے، وہ پوسٹر پر لگاتی تھیں اور جستہ تو جس علاقے سے ہیں، ان کا تو کاروبار ہی یہ

”جے۔“

جھٹ نے میکانیکی اعزاز میں ڈاکٹر اطہر کی تھی۔ ایک نکتہ بہت سی ساری اس میں جھٹ۔ سب کچھ ایک طرف اپنے علاقے کی بے حسیتی اسے گوارا نہیں تھی۔ اطہر نے بھی سنی خیر ہادی کو دیکھا تھا، جیسے کہا ہو ”ہوئی تھی، متوقع سرکاریوں کے کاروبار کی۔“

دارڈن کے جیلے پر تمام ہانچ۔ او۔ ڈین کے چورے سرخی سے دیکھ گئے۔

”ہوش میں ہیں آپ۔“ قطعی ادارے میں بیٹھ کر قصبہ پھیلا رہی ہیں۔“

دارڈن فوراً سنبھل۔

”فہم، میرا مطلب تھا کہ منگوانے سے پہلے مجھ سے اجازت لینی چاہیے تھی۔ آخر میں ذمہ دار ہوں ان بچیوں کی، پچھلے مجھ سے ہی ہوگی نا۔“

پہلے جھٹ کو پھر اپنے دفاع میں ہوشی دارڈن کو انجی اوڑی نے گھرا۔

”پہلے آپ تائیں، آپ کا اہم ہوا تھا، ایک میں کچھ ہے۔“

”سر مجھے کال آئی تھی۔“ وہ جلدی سے اپنے سواگل میں کال لاگز چیک کرنے لگی، سی آر جیسے ہی ڈیاں ایک میں ڈال کر باہر نکلا، اطہر نے اپنا نام لے کر دارڈن کو اطلاع دیا تھا۔ بات ساری واضح ہو چکی تھی لیکن انہیں روہ کر جھٹ پر فضا آ رہا تھا۔

”پہنچ فرسٹ انجیر کا ہے، آپ کیوں تھیں یہ لینے۔“ □

جھٹ کے بولنے سے پہلے ہی فرسٹ انجیر کی لڑکی ہاتھ ملتے سننے لگی تھی۔ ”سراسی آر نے کہا تھا۔ جس نے آرڈر دیا وہ رسد کرتے آئے۔“

سننے ہی ہی آر کو کانوں سے دھواں نکلا محسوس ہوا اور ڈاکٹر انجی اطہر کی جانب آئی۔ اطہر کو بھی امید نہیں تھی وہ اس کا نام لے دیں گے مگر اس وقت انجی اوڑی کا فصر قیامت سا سماں پھیلا رہا تھا، سب کو اپنی پڑی تھی۔

”ڈاکٹر اطہر کا مشورہ تھا۔“

سب کی میکانیکی اعزاز میں نظر اطہر پر آئی۔ بیز آنکھوں میں بے چینی کا پانی اٹھ آیا۔ کیا کوئی اتنا بھی کر سکتا ہے

آخر کو کلاس فیلوز تھے، ہادی کی منظمی سختی سے سمجھی گئی، جو پہلے کچھ دیر پہلے اس نے استہزا میں بولنے سے دو ہادی کے کانوں میں پہنچے تھے۔ ہادی کے ہاتھوں کی رگیں تن کر ابھرا تھیں۔ ایچ اوڈی کی نگاہوں کی سختی ہی کافی تھی اطہر کی جان نکالنے کے لیے۔ اس نے مکتے ہوئے سی آر کو ڈپٹا شروع کیا ہی تھا جب ایچ اوڈی نے وارڈن سے نمبر لے کر اپنے موہاگل میں ڈالنا شروع کیا۔ پہلے ہڈ سے ہڈی اطہر کا نام آئیں ہوا، ہڈ سے پورے ہونے تک اسی کا نام رہ گیا تھا، جلدی میں اس سے یہی فطری ہوتی تھی اپنے ہی نمبر سے کال کر دی۔ ایچ اوڈی نے اس کے ساتھ جو کرنی تھی سو کرنی تھی البتہ کرے سے نکلنے ہادی کا ہاتھ بے اختیار اٹھا اس کے گال پر نشان چھوڑ گیا۔

"I am ashamed of being your brother" (مجھے تمہارا بھائی ہونے پر شرم آرہی ہے)۔

فحش کو ایچ اوڈی نے اشارے سے باہر جانے کا کہا۔ سب بچے ایک ایک کر کے باہر نکل گئے تھے، خود انہوں نے بہت دیر اطہر کی کلاس کی تھی یہ وہی جانتا تھا اور تا حیات بھولنے والی کلاس نہیں تھی وہ۔



وہ رات اسے اپنی زندگی کی بہت سیارات گئی تھی۔ وہ جانتی تھی اس نے حیثیت سے بڑھ کر خواب دیکھ لیے ہیں لیکن ان خوابوں کی پامالی، اتحاد و الازام، پہلے چمک باب و رنگ سپلائی اور پھر وہ زمین جس پر اس نے چلنا بھاگنا سیکھا، اسے لوگوں میں اس کی بے عزتی، یہ حیثیت دی خانہ کئی ڈگری ہولڈر نے۔ نکل ہونے والی تقریب کی ساری خوشی آنسوؤں میں سیلی محسوس ہوئی۔ وہ کرے سے نکل کر گورنر کے در میں آئی تھی۔ رات کے سنائے کو چرتی جھگڑوں کی آوازوں میں کئی دن پہلے ہونے والی دہائی کی ٹیلی فونک کھٹکھٹاؤں کی سنائی دے رہی تھی۔

"فحش بچے! جب تم آئے گا حیران رہ جائے گا، بڑا کام کیا ہم نے یہاں۔"

"ہیہا کیا کر دیا دہائی۔"

"اس پاگل کے بچے کو سیدھا کر دیا ہے۔ کچھ ہی نکل جاتا ہے۔ یہاڑ سے کھجلی زمین پر رات کو بلب، لاشیں جلا کر کام پورا کر دیا ہے۔۔۔ کہتا ہے، میں بھی پڑھوں گا، فحش جتنا کہ کسی مگر کچھ تو آ کے پڑھوں۔ اب

دیکھو، دس بج گئے، ابھی تک نہیں آیا، مزدور بھی اسے گالیاں دے رہا ہوگا۔ ہللی۔“

پھر اٹکا اور بچا قبضہ تھا۔ اس وقت وہ قہقہے سے اپنے مستحکم کا مذاق اڑاتا تھا، لیکن اس وقت شیشے کی دھڑ کے پار دکھائی دیتی سیاحی میں نو حقیراتی عمارت کا ڈھانچہ نظر آرہا تھا، جس میں کہیں کہیں زرد بلب جل رہے تھے۔ سرخ اتاری گالوں پر بہتے پانی کی دھار اس نے دونوں ہاتھوں کی پتلیوں سے پھنکی، اپنے موہاگل سے ایک کال کر کے واپس اپنے کمرے میں آگئی۔



عام سادہ بہت خاص بن گیا تھا۔ پھر کالج ایسے لٹک رہا تھا جیسے اس مٹاتے میں مید کا سماں ہوا ہو۔ گراؤطر میں میڈ، مسوا اور آلات جراثیمی کی دھتر کہنہوں نے جا بجا اسٹال لگا رکھے تھے، حنکان صحت، وائرس سے بچاؤ، صاف پانی پر پڑے پڑے سبز کے سچ کالج کا آشفٹ جھنڈا لہر رہا تھا، چہاڑا طرف سفید کوٹ میں لمبوس تیز قدموں کی حرکت نے ایسا سماں ہاتھ کا تھا جھوٹا سا چمک بھی دیکھ لے تو اس ماحول کا حصہ بننے کی اسی دن سے قننا کرے۔

سیدھی کر، گردن اٹھائے سفید کوٹ والوں سے اپنے غریب نقل ہوتے ہی ہر دو قریب کا آواز ہوا۔ چھوٹے چھوٹے مقابلوں کے سچ جب ذکر یوں کی تقسیم پر اعلان شروع ہوئے، پہلا نام جو مایک میں گونجا تھا نہ صرف پرنسپل کا سر فخر سے اٹھا، بلکہ پورا U.H.S کا دلہا اعزازی تالیوں کے گونج اٹھا تھا۔ اعلان بار بار ہر دو تھا۔

”ڈاکٹر فحشہ جمال خان۔ ڈاکٹر فحشہ جمال خان۔ پلیز کم آن دی اسٹیج۔ پلیز۔“

اسٹیج کے پیچھے ہادی دیوار جتنی ہو جیکٹر اسکرین نصب تھی، جس پہلا ڈاکٹر فحشہ کے قلبی کامیابیوں کی فہرست چل رہی تھی، میڈیکل کالج کے مختلف موقعوں پر بی گئی تصاویر قریب سے اسکرین پر چلنے لگیں، کہیں کوئی انعام لیتے، کہیں کوئی اعزازی سند وصول کرتے، کوئی میڈل گلے میں پہناتے، اور دوشم پر کمرے کی پیئر سلسل نام لگا رہے تھے۔

”ڈاکٹر فحشہ کم آن دی اسٹیج۔“

کونج میں کوئی چاپ نہیں ابھری تھی۔ حشاشی دکھوں کے ساتھ گردنیں بھی اوپر اوپر کھڑکیں، ایک سال میں

ڈسٹکشن لینے والوں کے دل کی دھڑکن اتنی تیز تھی کب حد سے میڈل کا اعلان ہوگا، کب اسٹار پر جائیں گے، جو پانچوں سال میں ڈسٹکشن لے۔ جس کے لیے مہمان خصوصی پر ٹیگ انعام لے کر بیٹھا ہو، وہ تقریب میں غیر حاضر؟ وہ نہ تو کسی کو ہرانے آئی تھی نہ ہی جیتنے میں اسے تو سنگلاخ جھروں پر مرہم رکھنے تھے۔ اس تقریب کی ساری خوشی رات گئے بے ہنیا و انعام میں کا فور ہوئی، خود پر جیتے والی تالی کی خواہش نے دل میں دم ہی توڑ دیا تھا، میڈل فراور ڈگری تو بعد میں آفس سے بھی لی جاسکتی تھی مگر اس تقریب میں خود پر تالیاں بجا کر کیا الگ ٹل جاتا تھا، وہ اس میں سرے سے آئی ہی نہیں۔ حاضرین کی بے یقینی، چہ میگوئیاں روکنے کے لیے اسٹیکر میں دوسرے نام کو لپٹے گئے، ڈاکٹر ہادی خاموشی سے اٹھ کر دروازے کی سمت بڑھا اور اس کے تال پر کال ملاتے باہر نکل آیا۔

فون پر مسلسل تال جاری تھی مگر رسید نہیں ہو رہا تھا۔ ہادی کی بھنبھلاہٹ میں پریشانی کھل گئی۔ اس کے قدم خود بخود گر ہو تال کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ ابھی کچھ قافلے پر قہار تھا اور میں اپنی جھٹ وینڈ بیگ کٹنی میں ڈالے اپنا لڑالی بیگ تھمپتے کالج کے چیمپی اسٹیڈ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ تیزی سے اس کی جانب بڑھا۔

”کہاں جا رہی ہیں آپ؟“

”جہاں سے آئی تھی وہاں۔“ ہمارے بولی تھی۔

”سب کچھ میں چھوڑ کر، آپسے کیسے جاسکتی ہیں۔ میرا مطلب وہ کون کیسٹن؟“

وہ رکی، مڑی اور غصے لپے میں بولی۔

”جس مقصد کو آئی تھی وہ پورا ہو چکا ہے۔ ڈگری میں رسید کروں گی تو پرہائلم۔“

”جیہن۔۔۔۔۔“

اُس کے لپے میں کوئی اچھا سی ابھری۔ کل جو کچھ ہوا میں اس کی سفارت کرتا ہوں، بہت میں حرکت کی اظہار نے لیکن ایک کی مزاد دوسرے کو کیسے دے سکتی ہیں آپ، ڈاکٹر ٹیٹ۔“

اس نے لڑالی بیگ کا وینڈل چھوڑ کر بازو سینے پر لیے داخل اعزاز میں بولی تھی۔

”ویکیس ڈاکٹر ہادی! میں ایک پھاڑی لڑکی ہوں، وہ پھاڑ جو زمین کی میٹیں ہیں۔ یہ پھاڑ اپنے سلسلوں میں ہی قہقہے رچے ہیں، سلسلوں سے اپنی پھاڑیں لوگوں کے لیے ایک تقریبی مقام سے زیادہ کچھ نہیں۔ اور آپ

تو جانتے ہی ہیں تفریق مقام پر گھنڈ ڈالنا بھی ہمارا ایک کلچر ہے۔ ”وہ چھری چپ رہ کر اسے دیکھنے لگی پھر مضبوطی سے بولی تھی۔ ”ہم پٹھان سب برداشت کر لیتے ہیں لیکن کوئی ہمدردی ہاں کو گالی کالے ہم نہیں بھولتے، نکل میرے ملائے کو گالی نکالی گئی ہے۔“

اس نے بمشکل سانس کھینچی اور تلخ عراز میں ہانڈ کھول کر اپنے بیک کا جنڈل تھا، چادر ماتھے کی جانب سرکائی۔ ”اور رہی بات ڈاکٹر اطہر کی، تو انہیں شکریہ ادا کر دیجیے گا، فیصلہ کرنے میں انہوں نے آسانی کر دی۔ انہیں میرا پیغام دے دیجئے گا، پٹھان سب ہو سکتے ہیں بے غیرت نہیں۔ اور رہی آپ کی بات، تو..... آپ جیسے قابل ڈاکٹر کو بہت سی غلطیوں کا شکار بن گئی، لیکن ان بھانڈوں پر رہ جانے والی تمام غصہ کے آگے میرا غور و غرض فیصلہ دیا ارجمند دے گا۔ مجھے اپنی نسل کے آگے دیا انہیں بخشی۔ سو پلیز۔“

وہ بیک تھمتلی حیرتیز آگے کو بڑھی، پیہوں کی رنگت ہادی کو اپنے دل پر محسوس ہوئی تھی، جیسی اسٹینڈ پر اسروڈ لالہ اس کے انتظار میں کھڑے تھے۔ وہ بات ہی انہیں آنے کا کہہ چکی تھی۔ ہادی کا ہی چاہا وہ آگے بڑھے، لالہ سے ان کے گھر کا ایڈریس پوچھے، اچانک ان کے گھر پاؤں زمین سے چپک سے گئے تھے اور جیسی گرد اڑاتی نکلا ہوں سے دور بھاگتی جا رہی تھی۔ اڑتی کر کے ان دروں میں ہادی کو نہیں لگتا تھا وہ بھی ان سے اپنی جان چھڑا پائے گا۔ خوش بختی کی علامت، غصہ نہیں، محرومیت جگہ جگہ تھی۔

○..... قسم خدا.....○

